سرگزشتِ اقبالؒ

ایک محاکمہ

تالیف

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی

مکتبہ خیابان ادب ۳۹۔ چیمبرلین روڈ لاہور

بار اول : اپریل ۱۹۷۹ء

قیمت : چار روپے

مطبع : چٹان پریس ، میکلوڈ روڈ ، لاہور

طابع : مسعود شورش

ناشر : مرزا طارق نصیر بیگ
مکتبہ خیابان ادب
۳۹- چیمبرلین روڈ ، لاہور

سرگزشتِ اقبالؒ

ایک محاکمہ

از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

ایسوسی ایٹ پروفیسر

شعبۂ اُردو، پنجاب یونیورسٹی

مکتبۂ خیابانِ اَدب، لاہور

مندرجات

۱۔ تمہید

۲۔ سوانحِ اقبال — چند معروضات

۳۔ سرگزشتِ اقبال — ایک جائزہ

۴۔ م۔ ش کی ڈائری — ایک اقتباس

۵۔ ایک خط

۶۔ بلا عنوان

۷۔ مسئلہ اقبال کی تاریخِ ولادت کا

تمہید

گزشتہ برس چند تحریریں بہ سلسلۂ مطالعۂ اقبال لکھی گئی تھیں۔ احباب نے انہیں پسند کیا۔ یہ تحریریں اخبارات و رسائل میں چھپ کر سہل الحصول نہ رہیں۔ اکثر احباب انہیں دیکھنے کے شائق تھے اور تقاضا کرتے تھے۔ میں نے مناسب خیال کیا کہ ان تحریروں کو یکجا کر کے کتابچے کی صورت میں چھاپ دیا جائے تاکہ بحث کا تسلسل بھی قائم رہے اور یہ تحریریں عام دسترس میں بھی آسکیں۔

اس سلسلے کا پہلا مضمون ایک تقریر کی صورت میں تھا جو اقبال اُردو کانفرنس کے آخری اجلاس منعقدہ میرپور (آزاد کشمیر) میں ۸ نومبر ۱۹۷۷ء کو ہوئی۔ اسے قلم بند کر لیا گیا تھا اور بعد میں ہفت روزہ "پٹھان"، شمارہ ۲ جنوری ۱۹۷۸ء میں یہ مضمون شائع ہوا۔ دوسرا مضمون "سرگزشتِ اِقبال ۔ ایک جائزہ" تھا جو "صداقت" لاہور کے اقبال نمبر ۲۱ اپریل ۱۹۷۸ء میں چھپا۔ اس کا ایک ردِّ عمل ہوا۔ اور ۲۷ اپریل کو "صداقت" میں م۔ش صاحب نے اپنی ڈائری لکھتے ہوئے "سرگزشتِ اقبال" کے مؤلف کا دفاع کیا۔ اور اس مضمون کو ذاتیاتی تلخی کا ثمر اور جلے دل کے پھپھولے پھوڑنا قرار دیا۔ اس کے جواب میں راقم نے مدیر "صداقت" کے نام ایک وضاحتی خط اشاعت کے لئے لکھا۔ صحافتی دیانت اور صداقت شعاری کا معنوی تقاضا تو یہ تھا کہ یہ خط وہاں چھپتا لیکن "صداقت" میں بوجوہ یہ خط چھپ نہ سکا۔ تاہم ہفت روزہ "اسلامی جمہوریہ" نے اس خط کو ادارتی شذرے کے ساتھ اپنی ۷ مئی ۱۹۷۸ء کی اشاعت میں چھاپ دیا۔ م۔ش کی ڈائری کا متعلقہ حصّہ اور

وضاحتی خط بھی یہاں دے دیئے گئے ہیں۔ ۸/ مئی ۱۹۷۸ء کو راقم نے بینگ لائبریز سرکل سرگودھا کے زیرِ اہتمام "یومِ اقبال" پر ایک مضمون "بلاعنوان" پڑھا تھا جو "اسلامی جمہوریہ" کے ۱۵/ مئی کے شمارے میں چھپا۔ یہ مضمون اس بحث کی آخری کڑی تھا۔ لیکن اس کتابچے کا آخری مضمون "مسئلہ اقبال کی تاریخ ولادت کا" ہے جو ۱۷/ دسمبر ۱۹۷۸ء کو حلقۂ اربابِ ذوق میں جناب پروفیسر محمد عثمان صاحب کی صدارت میں پڑھا گیا اور ہفت روزہ "چٹان" بابت ۲۵/ دسمبر ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ چونکہ پہلے مضمون میں اقبال کی تاریخ ولادت کا مسئلہ بھی زیرِ بحث آیا تھا، اس لئے یہ مضمون یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سو، اب یہ منتشر تحریریں اس مجموعے کی شکل میں بہ تصحیح و ترتیب حاضر ہیں۔ بعض احباب نے انہیں انشائیے کہا ہے لیکن میرے خیال میں یہ انشائیے کی ادبی صنف سے قدرے الگ ہیں۔ زیادہ سے زیادہ انہیں تحقیقی انشائیے کہا جا سکتا ہے۔ تاہم میرا اس بارے میں کوئی دعویٰ نہیں۔ یہ قارئین جانیں اور ان کا کام۔ میرا مقصد صرف اتنا ہی تھا کہ اقبال کے نام پر قائم ہونے والے سرکاری و نیم سرکاری اداروں کے بارے میں متنبہ کر دوں کہ ان اداروں کو پیرانِ تسمہ پا کی دست بُرد سے بچایا جائے۔ اقبالی اداروں کو اقبال اور فکرِ اقبال کے حریفوں اور ذہنی و جسمانی طور پر معذور دانشوروں کے لئے دارالشفقت نہ بنایا جائے۔ ان دانشوروں کی سرپرستی ناگزیر ہے تو اس کے لئے "رائٹرز گلڈ" ایک ادارہ موجود ہے، اس ادارے کے ساتھ ایک عدد دارالشفقت بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔

اقبالی اداروں میں صاحبِ عقیدہ، دیانتدار، مخلص اور ذی علم لوگوں کو لائیے تاکہ حکیم الامت علامہ اقبال کی حیات، افکار اور تصورات پر صحیح سمت میں کام ہو سکے۔ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

یونیورسٹی اورینٹل کالج

غلام حسین ذوالفقار

سوانح اقبالؒ

چند معروضات

یہ مضمون ۸ نومبر ۱۹۷۷ء کو اقبال اردو کانفرنس کے آخری اجلاس منعقدہ میرپور، آزاد کشمیر میں پڑھا گیا تھا، اب "نقوش" کا اقبال نمبر ۲ شائع ہوا ہے تو اُس میں میرے رفیق کار ڈاکٹر وحید قریشی کا مضمون "اقبال کی تاریخ ولادت" چھپا ہے جس میں انہوں نے مختلف نظریات پر بحث کر کے آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "ہمارے خیال میں علامہ کی پیدائش ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء قرار دینے کے قرائن زیادہ وقیع ہیں"۔ ڈاکٹر صاحب موصوف دانشوروں کی اُس کمیٹی کے ایک رکن تھے، جس کا ذکر میں نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ بعض دوسرے ارکان کمیٹی کی باتوں سے بھی مجھے یہی تاثر ملا کہ وہ ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کے حق میں تھے لیکن مرکزی سیکرٹری تعلیم کے ذریعے اُس وقت کی حکومت کا منشا یہ ظاہر کیا گیا کہ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء پر صاد کرنا ہے۔ چنانچہ صاد کر دیا گیا، سب دانشور منقار زیر پر رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ سابق حکومت نے اپنی مصلحتوں کے تحت ایک غلط تاریخ کا اعلان کر دیا اور موجودہ عبوری حکومت، معزول حکومت کے پروگرام کو آگے چلاتی رہی۔ اس میں تو کوئی مضائقہ نہیں کہ صد سالہ تقریبات پورے ایک سو سال بعد منائی جائیں یا ایک سو چار سال بعد، میری رائے میں اقبال کے افکار کی اشاعت ایک مسلسل عمل ہے۔ یہ عمل کسی ماہ و سال کا پابند نہیں، لیکن نیم سرکاری اداروں اور ان کی رَو میں عام ناشروں نے بھی اپنی مطبوعات

ہیں قطعی طور پر ۹ نومبر ۱۹۶۷ء کی تاریخ چھاپ کر جو عالمانہ کام کیا ہے وہ ہماری علمی تاریخ میں " دانشورانہ بدانتت " کا زندہ جاوید نمونہ رہے گا۔

سوانح اقبال کے سلسلے میں میری ان معروضات کو سن کر میرے ایک محترم دوست نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے آغا شورش کاشمیری کی " اقبالی مجرم " پڑھی ہے۔ میں نے اعتراف کیا کہ ابھی اُسے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ انہوں نے فرمایا " اسے ضرور دیکھ ڈالیئے " لاہور واپس آکر پہلا کام یہی کیا۔ معلوم ہوا کہ نیم سرکاری اداروں کے بارے میں آغا صاحب مرحوم اور میرے خیالات میں کچھ توارد ہوگیا ہے، مَیں آغا صاحب مرحوم کی بصیرت اور حق گوئی کا پہلے بھی معترف تھا، اب اور بھی قائل ہوگیا۔

اسرارِ خودی کی تکمیل و اشاعت ۱۹۱۵ء میں ہوئی اور رموزِ بے خودی ۱۹۱۸ء میں چھپی۔ ڈاکٹر نکلسن کا انگریزی ترجمہ اسرارِ خودی انگلستان میں ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔ یہ سنین میں نے اس لئے عرض کئے ہیں کہ ان کے ساتھ اقبال کی ذہنی سرگزشت کی ایک داستان وابستہ ہے۔ اسرارِ خودی چھپی تو اس پر بعض صوفیوں کے حلقوں میں ایک بڑا ہنگامہ برپا ہوا، حافظ شیراز کے پرستار از حد خفا ہوئے، افلاطون کو ماننے والے بھی بہت ناراض ہوئے۔ اقبال کو دشمنِ تصوف قرار دیا گیا۔ حالانکہ دس سال پہلے وہ خود ایک پُرجوش وحدت الوجودی تھے اور حافظ کے اتنے مداح تھے کہ بقول خود " جب میرا ذوق جوش پر آتا ہے تو حافظ کی رُوح مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور میں خود حافظ بن جاتا ہوں " ہندوستان میں تصوف دوستی اور تصوف دشمنی کی یہ بحثیں ابھی نیم گرم تھیں کہ ڈاکٹر نکلسن کے ترجمۂ اسرارِ خودی کی اشاعت کے بعد یورپ میں بھی فلسفۂ خودی پر بحثوں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ اور یورپی تبصرہ نگاروں نے بعض ایسے شگوفے چھوڑے جن کی اثر آفرینی سے تنقید

اقبال ابھی تک پیچھا نہیں چھڑا سکی۔

اینتھینیم (ATHENAEUM) کے ریویو نگار نے اقبال اور نطشے کے افکار میں سطحی مشابہت کی بنا پر اقبال کو نطشے کا خوشہ چیں قرار دیا۔ اور ہمارے بعض دانشور ابھی تک اسی سُراب کا شکار چلے آتے ہیں۔ یہی حال اقبال کے فلسفہ سخت کوشی و توانائی اور اسلام کے نظریۂ قومیت کا ہوا جسے فرنگی دانشوروں نے جنگ و جدل کا فلسفہ قرار دیتے ہوئے اپنے دیرینہ صلیبی احساس کے تحت اسلام کو سفاکی اور خونریزی کا سرچشمہ قرار دیا اور اقبال کو اس کا مبلّغ ٹھہرایا۔ اس طرح کی باتیں جب اقبال کے علم میں آئیں تو انہوں نے ڈاکٹر نکلسن کے نام ایک طویل خط لکھ کر (محررہ ۲۴ جنوری ۱۹۲۱ء) ان مغالطوں کو دُور کرنے کی کوشش کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسرار و رموز تک پہنچنے میں اقبال کو ذہنی کشمکش اور اضطرابِ رُوحانی کے جس کربناک دَور میں سے گزرنا پڑا۔ اُس کا ہم آج تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ اقبال کے ذہنی ارتقا کی حقیقی سرگزشت کے بغیر ہم اُن تبدیلیوں کا احساس بھی نہیں کر سکتے جو حصول تعلیم کے لئے یورپ جانے سے پہلے' یورپ کے زمانۂ قیام میں اور سفر یورپ سے واپسی کے بعد اقبال میں پیدا ہوئیں۔ یہ ایک بڑا اہم مسئلہ تھا جسے اقبال نے اُسی زمانے میں محسوس کر لیا تھا۔ جب وہ اِن مباحث سے دوچار تھے اقبال نے جس طرح زوالِ اُمّت کی تشخیص کی تھی اور پھر اس کا علاج سوچا تھا' اِس نصب العین اور پیغام کی وضاحت کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنی اس ذہنی کشمکش کی مختصر رُوداد بھی لکھ جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بعض خطوں میں اس ضرورت کا ذکر بھی کیا ہے۔

سیّد سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اس کے علاوہ میں اپنے دل و دماغ کی سرگزشت بھی مختصر طور پر لکھنا چاہتا ہوں، اور یہ سرگزشت کلام پر روشنی ڈالنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اِس وقت میرے کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہیں، اس تحریر سے ان میں بہت انقلاب پیدا ہوگا۔"

(محررہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء اقبالنامہ حصہ اوّل ۱۰۹)

یہی بات اقبال نے اسی زمانے میں وحید احمد مدیر "نقیب" (بدایوں) کے نام ایک خط میں ذرا مختلف پیرائے میں کہی ہے، لکھتے ہیں:

"میری زندگی میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں، جو اوروں کے لئے سبق آموز ہو سکے۔ ہاں خیالات کا تدریجی انقلاب البتہ سبق آموز ہو سکتا ہے۔ اگر کبھی فرصت ہوگئی تو لکھوں گا۔ فی الحال اس کا وجود محض عزائم کی فہرست میں ہے۔"

(۲۷ نومبر ۱۹۱۹ء اقبال نامہ حصہ اوّل صفحہ ۴۲۶)

پھر ڈیڑھ سال بعد انہی وحید احمد کو یہ لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ کبھی فرصت ہوئی تو اپنے قلب کی تمام سرگزشت قلم بند کروں گا جس سے مجھے یقین ہے کہ بہت لوگوں کو فائدہ ہوگا۔"

(۷ ستمبر ۱۹۲۱ء۔ انوارِ اقبال، صفحہ ۱۰۶)

اقبال اگر یہ سرگزشت لکھ جاتے تو آج قارئین اقبال کے لئے اُن کے قلب و ذہن کے نہاں خانہ تک رسائی میں بہت آسانی رہتی۔ لیکن افسوس وہ اپنی مصروف زندگی اور روز افزوں مسائل و افکار کی وجہ سے اس کام کے لئے وقت نہ نکال سکے اور یہ خیال اُن کی لوحِ دل میں محفوظ چلا گیا۔ اب اس معاملے میں اقبال کا عام قاری مجبور ہے کہ اقبال کے اُن سوانح نگاروں کی طرف

رجوع کرے جو حقیقت میں افسانے کی ملاوٹ سے ایک ایسا سوانحی وتنقیدی ملغوبہ تیار کر کے چشم زدن میں پیش کر دیتے ہیں کہ جس پر عقل دنگ رہ جاتی ہے اور پھر ایسے ملغوبے سرکاری سرپرستی میں قائم شدہ اداروں کی طرف سے بڑے اہتمام اور صرفِ کثیر کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ اس طرح سرکاری گزٹ کی صورت انہیں سند کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے، جس طرح اب ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو اقبال کے یومِ ولادت کا سرکاری درجہ حاصل ہوگیا ہے۔

میں اقبال کی تاریخ ولادت کو متعین کرنے والی کمیٹی پر تنقید کرنا نہیں چاہتا ایک تو اس لئے کہ یہ کمیٹی واقعی دانشوروں پر مشتمل تھی جن کا میں بے حد احترام کرتا ہوں۔ دوسرے اس کمیٹی کو ملنے والی خفیہ ہدایات کا بھی مجھے کوئی علم نہیں اور نہ ہی وہ پُراسرار رُوداد میرے سامنے ہے جس کے تیار کرنے کے لئے اس کمیٹی نے یقیناً کئی شہروں کا دورہ کیا ہو گا اور ٹی اے، ڈی اے بھی وصول کیا ہو گا۔ تاہم میرا ذہن ابھی تک اس سرکاری تاریخ ولادت کو قبول نہیں کر سکا!

سرکاری سرپرستی کے فائدے بھی بہت ہیں اور نقصانات بھی کچھ کم نہیں۔ سرکاریں خوش ہونے پر آئیں تو ہاتھی بخش دیں، ناراضی کا اظہار کریں تو کولہو میں پلوا دیں۔ سرکاروں کے بعض اعلانات ہماری آرزوؤں کے آئینہ دار ہوتے ہیں، سُن کر طبیعت خوش ہو جاتی ہے اور جب اعلان کے سرپردہ سے حقیقت کچھ اور ہی نکلتی ہے تو حالت ہماری اُس مسافر کی سی ہو جاتی ہے جس کی جیب کٹ گئی ہو اور زادِ راہ کی ساری پونجی جیب تراشوں کے چیئرمین کی تجوری میں پہنچ گئی ہو!

اب یہی دیکھیے کہ عالمِ اسلام کی سربراہی کانفرنس ہماری ایک دیرینہ آرزو کی آئینہ دار تھی لیکن یہی کانفرنس جب وطنِ عزیز کے تحت لحنت ہونے پر پھر تصدیق

ثبت کر کے تیسری دنیا کے سراب میں کھو گئی تو احساس رکھنے والے اہلِ درد کو اس سے کتنا صدمہ ہوا ہو گا؟ قائدِ اعظم کا صد سالہ جشنِ ولادت بھی قوم کے دل کی آواز تھی لیکن بانئ پاکستان کے نام پر اتنا بڑا جشن منا کر اور اتنا بڑا بین الاقوامی اجتماع کر کے پاکستان بنانے والی قوم سے کیا سلوک کیا گیا اور خود قائدِ اعظم سے کیا مذاق ہوا؟ یہ سب کچھ سامنے کی باتیں ہیں۔ اقبال کے نام پر بھی ہماری آنجہانی سرکار اور اس کے پروردہ دانشور بہت سے عزائم رکھتے تھے اور ابھی کچھ پتہ نہیں کہ اس جشن کے لئے کیا کیا شگوفے تیار ہوئے ہیں؛ جب شاہانہ سرپرستی میں تیار ہونے والی مطبوعات سامنے آئیں گی تو پھر معلوم ہو سکے گا کہ ہمارے دانشور اقبال کو کیا رنگ دینا چاہتے ہیں اور اقبال کے نام پر اپنی دکانِ تجارت کس طرح چمکاتے ہیں۔

اور یہ کوئی آج ہی کا مسئلہ نہیں ہے۔ اقبال کے ساتھ ماضی میں بھی کچھ ایسے ہی سلوک ہو چکے ہیں جو ان اندیشوں کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے جب قیامِ پاکستان کے بعد سیکولر ازم کے پرستار ملکی دستور کو سیکولر بنیادوں پر تشکیل دینے کے لئے بڑے مضطرب اور سرگرم تھے اور ان کے غیر ملکی آقا ان کی ہر طرح دامے، درمے، سخنے امداد کر رہے تھے تو ہمارے ملک کے ایک سیکولر دانشور نے "اقبال اور مُلّا" لکھ کر ایک ایسے ہی نیم سرکاری ادارے کی طرف سے ہزاروں کی تعداد میں چھپوا کر شائع کی تھی، مقصد کیا تھا؟ اقبال کے حوالے سے دینی احساس کا مذاق اُڑایا جائے۔ نام نہاد "ملائیت" کے پردے میں اسلامی اقدار کی تضحیک کی جائے! پھر اسی ادارے نے ایک اور دانشور سے اقبال کی ایک سوانح عمری لکھوا کر بھی شائع کی۔ اس سوانح عمری میں کتنی حقیقتیں ہیں اور کتنے افسانے؟ اس مختصر تحریر میں اس کا احاطہ اور تجزیہ نہیں ہو سکتا۔

نمونے کے طور پر صرف ایک ہی افسانہ سن لیجئے اور اس سے اس افسانہ نگار کے خبثِ باطن کا اندازہ لگا لیجئے۔ لکھا ہے :

"بچپن میں اقبالؒ کو بٹیریں پالنے، کبوتر اڑانے اور اکھاڑے میں ورزش کرنے کا بہت شوق تھا، مولانا میر حسن کے صاحبزادے سید محمد تقی ان مشاغل میں ان کے شریک تھے اور مولانا میر حسن بھی منع نہ کرتے تھے بلکہ ایک دفعہ مولانا نے دیکھا کہ اقبال سبق پڑھ رہے ہیں اور ایک ہاتھ میں بٹیر تھام رکھی ہے۔ آپ نے فرمایا "کم بخت! اس میں تجھے کیا مزا ملتا ہے؟" تو اقبال نے برجستہ جواب دیا کہ "حضرت! ذرا اسے پکڑ کر دیکھیے!"

قطع نظر اس سے کہ اس "گپسانے" کا مآخذ کیا ہے؛ یہ امر غور طلب ہے کہ انیسویں صدی کے ربع آخر کا ایک طالب علم اپنے واجب الاحترام استاد کو یہ برجستہ جواب دے رہا ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب ہماری اخلاقی حالت باوجود زوال و انحطاط کے اتنی گری ہوئی نہیں تھی جتنی ہم آج دیکھتے ہیں لیکن میں نے تو آج کے شاگردوں کو بھی کم از کم اس سطح پر اُتر کر اپنے استادوں کو برجستہ جواب دیتے ہوئے نہیں دیکھا چہ جائیکہ اقبال جیسا شاگرد، میر حسن جیسا اُستاد اور زمانہ انیسویں صدی کا!

معلوم نہیں یہ افسانہ لکھ کر موصوف نے کونسا کارنامہ سرانجام دیا؟ کن لوگوں کو خوش کرنا اس کا مقصود تھا؟ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس قسم کی باتوں سے بظاہر دو ہی گروہ خوش ہو سکتے ہیں، ایک قادیانی، دوسرے یونی نسٹ، دونوں گروہوں کی اقبال دشمنی کی اپنی اپنی وجوہ ہیں اور یہ کوئی راز کی باتیں نہیں ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ دانشور موصوف کا ان

گروہوں سے کیا تعلق رہا تھا اور خود اقبال کا اس دانشور کے بارے میں کیا خیال تھا؛ (کیونکہ یہ باتیں علمِ سینہ سے تعلق رکھتی ہیں!) ان دو گروں کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی اس سے خوش ہو سکتا ہے لیکن اسے افکار کی فکر ہے، شخصیت سے کوئی زیادہ سروکار نہیں۔

کچھ ایسی ہی بے سروپا کہانیاں اُن پری چہرہ دانشوروں کی بھی ہیں جو حیاتِ اقبال کے جذباتی "ادوار کی تلاش میں خورد بین لے کر ان کی نظم و نثر میں اسرارِ محبت کی جستجو کرتے ہیں۔ (جنسی جذبہ اور نفسیاتی "تجزیہ اپنی جگہ ایک علم سہی، اگرچہ یہ علم بھی نیم صداقت سے زیادہ دقیع نہیں، اس علم کے ماہر اگر اپنا شوق پورا کرنا چاہیں تو انہیں کون روک سکتا ہے) تو سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح اقبال کے حوالے سے وہ اپنے حسن و جمال کے دام تو بڑھا سکتے ہیں۔ مگر اس سے حیاتِ اقبال کا کونسا گوشہ حل ہوتا ہے؟

بہرکیف سوانح اقبال کی تالیف و تدوین کا مسئلہ بے حد اہم اور از حد ضروری ہے لیکن اس مسئلے کو اگر کرائے کے دانشوروں پر چھوڑا گیا تو اس سے بڑی قباحتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ عام مشاہدہ یہ ہے کہ جب سرکاری اداروں کو بعض اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لئے لاکھوں کی گرانٹیں ملتی ہیں تو TOLET قسم کے دانشور گدھوں کی طرح ان اداروں کے گرد منڈلانے لگتے ہیں اور کوئی ان کا نام تجویز کرے یا نہ کرے، یہ خود اپنا نام تجویز کرنے میں کوئی شرم و عار محسوس نہیں کرتے۔ میں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا، لیکن حیاتِ اقبال کی تدوین کے سلسلے میں چند ضروری باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں، 'حیاتِ اقبال' (اور اسی طرح قائدِ اعظم کی سوانح عمری بھی) ایسے عظیم کام کے بارے میں اگر ہم سنجیدہ ہیں، تو ان کا فوراً آغاز کر دینا چاہیئے اور ضروری ماخذ و مصادر کی فراہمی اور تدوین کے

ابتدائی مرحلے کو پہلے طے کرنا چاہیئے۔ یہ کام سرکاری امداد اور تائید سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ تاہم یہ حقیقت یاد رہنی چاہیئے، کہ اگر حکومت کے موقف اور اقبال کے نصبُ العین میں ہم آہنگی ہوگی۔ تب ہی یہ امداد مفید ثابت ہوسکتی ہے ورنہ نہیں، سابقہ حکومتوں کا موقف بڑا پُراسرار قسم کا ہوتا تھا۔ اِسلام کا نام بھی تھا۔ قرار دادِ مقاصد بھی تھی اور اس سے انحراف کی حکمتِ عملی بھی تھی۔

مَیں یہ بات دو ٹوک کیوں نہ کہہ دوں، کہ اس ملک میں دینی اور لادینی (سیکولر) نظام کا تصادم ہی ہماری تمام مشکلات کا بنیادی سبب ہے۔ سیکولر نظام کے حامی ایک حقیر اقلیت میں ہونے کے باوجود شروع ہی سے پاکستان کو اس کے تخلیقی مقصد (احیائے دین) سے دُور لے جانے کی فکر میں مبتلا رہے ہیں اور بھیس بدل بدل کر ہر دَور میں کچھ نہ کچھ پیش قدمی ہی کرتے رہے ہیں۔ ان کی بَلا سے، ایسا کرنے سے یہ ملک باقی رہتا ہے یا نہیں۔ اَب بھی یہ دھندا ملحد دانشوروں اور شکم پرست افسروں کی یہ کھیپ بڑی مستعدی سے کر رہی ہے۔

اگر حکومت کی منزل متعین ہوجائے کہ وہ کدھر جانا چاہتی ہے تو اقبال اور قائدِاعظم کی سچّی سوانح عمریاں بھی لکھی جاسکتی ہیں۔ اس ملک کا مستقبل دینِ مصطفےٰ کے نفاذ سے وابستہ ہے۔ یہی نصب العین مفکرِ پاکستان کا تھا اور قائدِ اعظم بھی پاکستان کو ایک اسلامی مملکت بنانا چاہتے تھے۔ اس لئے جہت متعین ہوجائے۔ تو کسی کو یہ جرأت نہیں ہوسکتی کہ اِن اکابرِ پاکستان کی زندگیوں کے بارے میں کوئی تشکیک یا ابہام کی صُورت پیدا کرسکے۔

مخلصانہ کام کرنے والوں کی ملک میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اقبال اور قائدِ اعظم کی سوانح عمریاں دردمند فقرا ہی لکھ سکتے ہیں اور بلا معاوضہ کام کرسکتے ہیں، گریڈ (grade) اور گریڈ (greed) کے چکروں میں پھنسے ہوئے شکم پرست

دانشور یہ کام نہیں کر سکتے، ہرگز نہیں کر سکتے۔ اور یہ بات میں اس فن "سوانح نگاری" کے مبادیات سے باخبر ہونے کی بنا پر کہہ رہا ہوں، سوانح نگاری دل سوزی کا فن ہے، محض علمی نمائش نہیں۔

لیکن مخلص کام کرنے والوں کے سامنے ایک بڑی مشکل اُن ماخذ و مصادر تک رسائی حاصل کرنا ہے جو حکومت اور اس کی سرپرستی میں کام کرنے والے اداروں کے پاس فروخت یا محفوظ کئے جا رہے ہیں۔ آخر کام تو انہی کی بنیاد پر ہونا ہے۔

یہ مسائل غور طلب ہیں، میں آپ کو دعوتِ فکر دیتا ہوں اور خود بھی سوچوں گا، ان کا حل ہمیں تلاش کرنا ہے، ہر صورت، ہر قیمت پر!

(اقبال اُردو کانفرنس کے آخری اجلاس منعقدہ میرپور آزاد کشمیر میں ۸ر نومبر ۱۹۷۷ء کو پڑھا گیا۔)

سرگزشتِ اقبال — ایک جائزہ

چند ہفتے ہوئے ایک دانش مند دوسرے دانش مند کی عیادت کے لئے گیا۔ مریض کے سرہانے میز پر سالِ اقبال کی مطبوعات کا ڈھیر پڑا تھا۔ سبز رنگ کے سادا و خوبصورت گرد پوشوں میں لپٹی ہوئی اقبال اکیڈمی کی مطبوعات! برسبیل تذکرہ صاحبِ فراش دانشمند نے اپنی رائے کا اظہار اِن الفاظ میں کیا:

"اِن کتابوں کو دیکھ کر تو قے آنے لگتی ہے"۔ یہ رائے خاصی انتہا پسندانہ اور مبالغہ آمیز کہی جا سکتی ہے لیکن کسی پہنچے ہوئے بزرگ کی رائے کو یونہی نظر انداز کرنا بھی مشکل ہے۔ چند روز قبل اکیڈمی کی کچھ مطبوعات راقم کی نظر سے بھی گزریں۔ میری رائے دانشورانہ تو نہیں۔ طالبِ علمانہ ہی ہو سکتی ہے تاہم مَیں سمجھتا ہوں کہ سکور بنانے کے جوش میں اقبال اکیڈمی نے جو ڈھیر ساری کتابیں اقبال پر شائع کی ہیں، ان میں اکثر سرسری، سطحی اور سرکاری فنڈز کا اسرافِ بے جا قرار دی جا سکتی ہیں۔ سرکاری سرپرستی میں قائم ادبی اداروں میں مفادات کی کشمکش میں بعض مصنفین، کچھ منتظمین اور چھاپہ خانے جو "کارنامے" انجام دیتے ہیں، وہ تو ان کتب کو بادی النظر میں دیکھ کر ہی عیاں ہو جاتے ہیں۔ اور اگر اندرونِ خانہ کے کچھ کوائف بھی معلوم ہو جائیں تو سبحان اللہ، علم و ادب کی ترقی کے نام پر لوٹ کھسوٹ کا عجیب منظر سامنے آتا ہے۔ ایک برس قبل ۱۹۷۷ء کو سالِ اقبال قرار دیا جا چکا تھا اور حکیم الامت شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے صد سالہ جشنِ ولادت کو شایانِ شان طریقے سے منانے کے پروگراموں کا آغاز ۱۹۷۶ء میں ہو گیا تھا۔

دانشوروں اور افسروں کی کمیٹیاں بن گئی تھیں۔ معزول حکمران اپنے سیاسی عزائم کے تحت اس جشن کو بھی ایک خاص رنگ دینا چاہتے تھے۔ اور اس رنگین پروگرام کی خاطر خاص طرح کے لوگ پیش پیش تھے۔ جن میں کچھ سچ مچ کے اقبالیوں کو بھی دانۂ سپند کے طور پر رکھا گیا تھا۔ انقلابِ دوراں نے ان عزائم کو تو ملیامیٹ کر دیا لیکن جشنِ اقبال کے سلسلے میں جو پیش رفت جاری تھی، اس میں کسی نمایاں تبدیلی کے بغیر پروگرام جاری رہا کیونکہ مسئلہ قومی نوعیت کا تھا اور قوم کو اس سے دلچسپی تھی۔ پروگرام کے کئی مراحل تھے، جن کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لینا ضروری ہے کہ قومی اعتبار سے حکیم الامت کی شخصیت اور افکار کو پیش کرنے اور مطالعۂ اقبال (جو حقیقت میں مطالعۂ پاکستان اور مطالعۂ تحریکِ اسلامی بھی ہے) کو آگے بڑھانے میں ہم کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اور کہاں کہاں ہم سے لغزشیں ہوئی ہیں۔ اپنی فتوحات کے گن گانے کے ساتھ ساتھ اپنی پسپائیوں، کوتاہیوں اور لغزشوں کا محاسبہ بھی ہوتا رہے تو یہ احتسابِ نفس آئندہ کے لئے بہتر صورتیں پیدا کر سکتا ہے۔

ہم سرِ دست سالِ اقبال کی مطبوعات کے بے لاگ جائزے سے محاسبے کا آغاز کرتے ہیں۔ اور عام ناشروں سے قطع نظر کرتے ہوئے پہلے نیم سرکاری اداروں کی مطبوعات پر کہ جن پر قوم کے گاڑھے پسینے کی کمائی خرچ ہوئی ہے۔۔ تنقید و تبصرہ کرتے ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ تنقید ذاتی آلائش سے پاک اور تحقیقی صداقت پر مبنی ہو۔ خوبیوں کی تحسین ہو اور خامیوں کی نشاندہی ہو جائے؛ تاکہ عام قاری اس سے آگاہ ہو سکیں اور کتاب کی قدر و قیمت کا تعین کیا جا سکے۔ اداروں میں سرِ فہرست اقبال اکیڈمی پاکستان ہے جس کا سکور بھی اچھا خاصا ہے۔ (افسوس کہ اکیڈمی کی فہرست مطبوعات تا حال میری نظر سے نہیں گزری۔ اس لئے صحیح

سکور بتانے سے قاصر ہوں)۔ سب سے پہلے "سرگزشتِ اقبال" کا انتخاب کیا گیا ہے۔ کیونکہ حیاتِ اقبال کا مسئلہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے اس لئے پہلے اسی کا جائزہ لینا موزوں رہے گا۔

پاکستان میں اُردو ٹائپ کے چھاپے کا معیار خاصا اچھا ہے۔ لیکن اس کتاب کو انتہائی بدنما چھاپا گیا ہے اور رہی سہی کسر کٹائی اور جلد بندی میں پوری کر دی گئی ہے۔ اگر کسی صاحبِ ذوق کو صرف اسے دیکھ کر ہی قے آجائے تو کوئی تعجّب کی بات نہیں کہی جا سکتی۔ ڈھائی صفحے کے غلط نامے کے باوجود اغلاط کی تعداد بے شمار ہے۔ غالباً پروف ریڈنگ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی اور سکور بنانے کے شوق میں ان امور کو کوئی اہمیّت نہیں دی گئی۔ بہرکیف یہ مسئلہ انتظامی نوعیّت کا ہے یا اس کا تعلق ذوقِ جمال سے ہے۔ ہم صرف اس کی نشاندہی پر اکتفا کرتے ہیں اور کتاب کے متن کی طرف آتے ہیں۔

کتاب کے مصنّف ڈاکٹر عبدالسلام خورشید معروف دانشور ہیں، جرنلزم کے استاد بھی ہیں اور اخباری کالم نویس بھی۔ صحافت آبائی پیشہ ہے اور صحافت کے ذریعے علامہ اقبال سے ان کا رابطہ دو پشت سے ہے۔ یعنی ان کے والدِ مکرّم مولانا عبدالمجید سالک اپنے زمانے کے مشہور صحافی تھے اور اسی واسطے سے اقبال کی صحبت میں بھی باریاب تھے۔ عبدالسّلام خورشید کو بھی بقول ان کے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سلسلے میں کچھ طالب علم لیڈروں کے ہمراہ علامہ کے حضور پہنچنے کا موقع ملا۔ اس لئے وہ بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ "دوسری پُشت ہے اقبال کی مدّاحی میں"۔ سالک صاحب ۱۹۵۵ء میں ذکرِ اقبال لکھ کر اقبالی سلسلے سے منسلک ہوئے اور اب ابنِ سالک نے سرگزشتِ اقبال لکھ کر ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ سالک صاحب ایک صحافی تھے۔ اپنے رفیقِ کار مہر صاحب کی طرح

محقق نہیں تھے پھر ان کا طبعی رجحان بھی افکار و حوادث لکھتے لکھنے چٹکلے بازی کا ہو گیا تھا۔ دوسروں پر طنز و تعریض کر سکتے تھے۔ دوسرے ان پر طنز و تعریض کریں تو بہت سنجیدہ ہو جایا کرتے تھے۔ کچھ ان کی خاندانی روایات تھیں اور کچھ پیشہ صحافت کی کاروباری مجبوریاں کہ قادیانیوں کے متعلق دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے اور یونینسٹوں کی وفاداری سے لاتعلق نہیں ہو سکتے تھے۔ دوسری طرف ان دونوں گروہوں کے بارے میں اقبال کے نظریات بڑے واشگاف ہیں۔ نیتوں کا حال اللہ بہتر جانتا ہے۔ لیکن سالک ان دوہری محبتوں اور وفاداریوں کی وجہ سے اقبال کے سوانح لکھنے کے اہل ثابت نہیں ہو سکے۔ ایک طرف مدح اقبال میں بے تحقیق حکائتیں ہیں تو دوسری طرف ایسی بے بنیاد روائتیں ہیں جو طنز و تعریض کے زہر سے خالی نہیں۔ ابن سالک نے نہ صرف اپنے والد مکرم کی بیان کردہ ان روائتوں کو برقرار رکھا ہے، بلکہ انہیں تقویت پہنچانے کے لئے وہ عینی شاہد بھی بن گئے ہیں۔ مثلاً سالک نے ذکرِ اقبال کے بارے میں عقیدت مندانہ روایات کو بڑے خیال انگیز پیرائے میں بیان کرتے کرتے مقطع میں ان کی بٹیر بازی کا قصہ یوں بیان کیا ہے۔

"بچپن میں اقبالؒ کو بٹیریں پالنے، کبوتر اُڑانے اور اکھاڑے میں ورزش کرنے کا بہت شوق تھا۔ مولانا میر حسن کے صاحبزادے سید محمد تقی ان مشاغل میں ان کے شریک تھے۔ اور مولانا میر حسن بھی منع نہ کرتے تھے۔ بلکہ ایک دفعہ مولانا نے دیکھا کہ اقبال سبق پڑھ رہے ہیں اور ایک ہاتھ میں بٹیر تھام رکھی ہے۔ آپ نے فرمایا "کم بخت! اس میں تجھے کیا مزا ملتا ہے؟" تو اقبال نے برجستہ جواب دیا کہ "حضرت! ذرا اسے پکڑ کر دیکھیے"!

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید بلا حوالہ و استناد نہ صرف اس بے بنیاد روایت

کا راوی خود حضرت علامہ کو قرار دیتے ہیں۔ بلکہ اپنی گواہی کا بھی اضافہ کرتے ہیں۔ "اور اتنی بات کا تو راقم الحروف بھی چشم دید گواہ ہے کہ حضرت علامہ نے میاں نظام الدین کے آموں کے باغ میں لاہور کے اہلِ علم سے خوش گپیوں کے دوران میں بٹیر بازی کے فن پر گفتگو فرمائی اور ہاتھ سے بٹیر کو "مٹھیانے" کا طریقہ بتایا۔ رہی استاد کے سامنے شاگرد کی جسارت کا مسئلہ تو یہ جسارت نہیں ایک طفلانہ شوخی تھی۔ جس کی اچھے استاد قدر کرتے ہیں"۔ (سرگزشتِ اقبال صفحہ ۲۲)

"چشم دید گواہ" نے اس واقعے کا زمانہ نہیں بتایا اور نہ ہی اپنی اس وقت کی عمر ہی بتائی ہے۔ یوں انہوں نے ۱۹۳۷ء کے آخری چند ماہ میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سلسلے میں طلباء کے ساتھ چار پانچ مرتبہ علامہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ذکر متعدد جگہوں پر کیا ہے۔ (سرگزشتِ اقبال ۵۴۱، ۵۵۹، ۵۶۲)

خورشید صاحب نے اس وقت اپنی عمر اٹھارہ سال سے کم بتائی ہے۔ ظاہر ہے اس زمانے میں علامہ اپنی مسلسل علالت کی بنا پر میاں نظام الدین کے آموں کے باغ میں خوش گپیوں کے لئے نہیں جا سکتے تھے۔ یہ کام وہ چند برس پہلے کر سکتے تھے اور اس وقت خورشید صاحب کی عمر اور بھی کم ہو گی۔ ایک جگہ (صفحہ ۴۴ الف) انہوں نے بچپن میں اپنے والد کے ساتھ باغ میں جانے کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ "جب میں بہت چھوٹا تھا"۔ یہاں بھی انہوں نے حضرت علامہ کی خوش گپیوں کا ذکر کیا ہے۔ البتہ مذکورہ بالا واقعہ بیان نہیں کیا۔ ہم جناب خورشید صاحب کی بچپن کی شہادتوں پر اعتبار کر لیتے لیکن ایک تو ان کے اپنے بیانات متناقض ہیں۔ دوسرے ان کے ثقہ راوی ہونے کا مسئلہ بچپن تو کیا جوانی اور بڑھاپے میں بھی مشکوک ہے۔ موصوف کی تحقیقی بصیرت اور معیار نقد و نظر کے ایک واقعہ کا راقم الحروف بھی عینی شاہد ہے۔ اس سے قارئین بھی ان کی علمی ثقاہت کا اندازہ

لگا سکتے ہیں۔ دھوہذا :

چند برس قبل ایک بیرونی امیدوار (شاید لائل پور کا تھا) نے ایم۔اے اُردو کا امتحان دیا اور ساتویں پرچے میں مضمون کی بجائے مقالہ پیش کیا۔ موضوع تھا "مولانا عبدالمجید سالک"۔ اُردو بورڈ آف سٹڈیز نے موضوع کی مناسبت سے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کو اس مقالے کا خارجی ممتحن مقرر کر دیا۔ اُمیدوار کا زبانی امتحان ہو چکا تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ایسا اوریجنل تحقیقی مقالہ اورینٹل کالج میں آج تک نہیں لکھا گیا ہوگا۔ ان کی رائے میں اس مقالے کے نمبر استحقاق کی بنا پر تو سو سے زیادہ ملنے چاہئیں لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو امیدوار کو سو میں سے سو نمبر تو ضرور دیئے جانے چاہئیں۔ ہم اس مبالغہ آمیز تحسین پر بہت متعجب ہوئے اور اپنی سابقہ ساری تحقیقی کارکردگی پر پانی پھرتے دیکھ کر پریشان بھی ہوئے۔ بہرکیف صدرِ شعبہ نے کہا کہ ہمارے ہاں بہت اچھے مقالے پر نوّے تک نمبر دینے کی روایت ہے اور اگر خارجی ممتحن کی نظر میں یہ مقالہ واقعی بہت اعلےٰ ہے تو یہ نمبر موزوں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نہ مانے۔ اپنی بات پر اصرار کیا۔ خیر بڑی رد و کد کے بعد شائد نوّے یا ایک دو زائد نمبروں پر فیصلہ ہو گیا۔ ایوارڈ تیار ہو کر دستخط ہو گئے۔ اتفاق سے اس کے فوراً بعد بورڈ آف ایگزیمنرز کی میٹنگ تھی جس میں ایم۔اے کے نتیجے کی تکمیل و توثیق ہونی تھی۔ ہم میٹنگ کے لئے سنڈیکیٹ روم میں گئے۔ صدرِ شعبہ (اور اجلاس کے کنوینر) نے اس امیدوار کے مقالے کا ایوارڈ بھی دفتر کے عملے کے حوالے کیا۔ اندراج کے بعد عملہ امتحانات نے امیدوار مذکور کے نتیجے کا چارٹ بڑے ڈرامائی انداز میں بورڈ کے ارکان کے سامنے لا رکھا۔ ہم سب کے سامنے ایک عجیب اور حیران کن صورتِ حال تھی۔ یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلا اوریجنل تحقیقی مقالہ لکھنے والا امیدوار باقی چھ کے چھ پرچوں میں بُری طرح فیل تھا!

ڈاکٹر صاحب موصوف کا اور یجنل تحقیق کے بارے میں اپنا کوئی معیار اور "اچھے استاد" کے بارے میں بھی اپنا کوئی تصوّر ہوگا۔ لیکن افسوس کہ اس سے اکثر لوگ اتفاق نہیں کریں گے۔ شاید وہ خود اپنے تصوّر کے مطابق ایک "اچھے استاد" ہوں، اور اس قسم کی "طفلانہ شوخیوں" کا بھی کچھ تجربہ رکھتے ہوں، جن کا "بُرے استادوں" کو آج تک کوئی علم نہیں ہو سکا۔

ہماری رائے میں حضرت علامہ کے بارے میں بے بنیاد روایتوں اور "گپ بازوں" کی تکرار سے کوئی فائدہ نہیں۔ اقبال کو بٹیر باز ثابت کرنے سے سالک کو کیا ملا، جو ابن سالک کو مل جائے گا۔ اقبال کی زندگی ایک کھلی کتاب ہے۔ نہ عقیدت کی بیساکھیاں اس کی عظمت کو چار چاند لگا سکتی ہیں۔ نہ اس قسم کی تعریضیں اس کا کچھ بگاڑ سکتی ہیں۔ اقبال کی عظمت اس کے اپنے حقیقی کردار میں ہے جس پر اس نے کوئی پردہ نہیں ڈالا ہے۔ اقبال کا سوانح نگار حقائق کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی ان کی شخصی عظمت اور ان کے افکارِ عالیہ کا ترجمان بن سکتا ہے لیکن پہلے سوانح نگار کو بھی تو کچھ ان اوصاف کا مالک ہونا چاہیئے جو اقبال کی سوانح نگاری کے لئے ضروری ہیں۔ کم از کم کوئی نرگسی مزاج کا شخص اقبال کا سوانح نگار نہیں ہو سکتا۔

"سرگزشتِ اقبال" ان معنوں میں سوانح عمری ہے بھی نہیں کیونکہ اس میں خارجی حالات اور صحافتی معلومات کا اتنا طومار ہے کہ شخصیت ان میں دب کر رہ گئی ہے اور جہاں شخصی حالات آئے بھی ہیں وہاں سالک، نذیر نیازی اور دوسرے مصنفین کے بیانات کا سہارا لینے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ مصنف نے خود تحقیق اور تجزیے کے بکھیڑے میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ اس کی ایک عجیب و غریب مثال ملاحظہ فرمائیے۔ سترھواں باب اقبال کے خطبات کے بارے میں ہے۔ مصنف لکھتا ہے:

"خطبات مدراس یا دوسرے لفظوں میں "تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" سات مقالات پر مشتمل ہے۔ یہ مقالات ۱۹۲۹ء کے آغاز میں مدراس مسلم ایسوسی ایشن کی دعوت پر پڑھے گئے۔ اس کے بعد حیدر آباد دکن اور علی گڑھ کی علمی محفلوں میں بھی پیش کیے گئے۔" (سرگزشتِ اقبال صفحہ ۲۵۲)

اس کے بعد چھ خطبوں کا خلاصہ کتاب سے کیا گیا ہے اور صفحہ ۲۶۲ پر لکھا ہے۔ "ساتویں خطبے کا عنوان تھا "کیا مذہب ممکن ہے یا کیا مذہب کا امکان ہے؟" یہ خطبہ خطبات مدراس میں شامل نہ تھا بلکہ ارسٹوٹیلین سوسائٹی لندن کی دعوت پر لکھا گیا تھا۔" اس کے بعد اس خطبے کا خلاصہ اور پھر صفحہ ۲۶۵ پر لکھتے ہیں:

"مدراس میں سہ روزہ قیام کے بعد حضرت علامہ بنگلور پہنچے ...... الخ"

اب ان بیانات کا ذرا تجزیہ کیجیے۔ علامہ اقبال سہ روز (یعنی تین دن) مدراس میں رہے۔ چھ خطبے دیئے۔ باقی تقریبات، سپاسنامے اور جوابی تقاریر اس کے علاوہ، یعنی اوسط دو خطبے روزانہ ہوئے۔ کیا یہ امر واقع ہے؟ اگر مصنف میں کچھ بھی سوجھ بوجھ ہوتی تو وہ ایسی فاحش غلطی نہ کرتا اور تھوڑے سے تفحص کے بعد اسے یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ حضرت علامہ نے مدراس میں صرف تین خطبے دیئے تھے۔ بقیہ تین خطبے اسی سال ۱۹۲۹ء کے اواخر میں علی گڑھ میں دیئے گئے تھے۔ لیکن ان بنیادی معلومات کی تحقیق تو کوئی سوانح نگار ہی کر سکتا تھا۔ کسی تبصرہ نگار یا کالم نویس کے بس کا یہ روگ نہیں ہو سکتا۔

ساری کتاب میں خارجی حالات و واقعات کے طویل اذکار سے مصنف کو کتاب کے بے توازن ہونے کا کہیں احساس نہیں ہوا۔ صرف ایک جگہ اسے خیال آیا ہے۔ "علامہؒ نے ان مقالات کا ایک نہایت جامع جواب لکھا۔ پوری بحث کو سمیٹنا تو ہمارے لئے ناممکن ہے یہ کتاب اس کی متحمل نہیں ہو سکتی ہے (صفحہ ۶۹۴)

اور پھر علامہ کے مضمون سے چار پانچ سطریں اور سالک کی کتاب سے چند سطریں (جن کا اصل بحث سے کوئی زیادہ تعلق نہیں) پیش کر کے ایک اہم مسئلے پر اقبال کے ایمان افروز موقف کو گول کر دیا گیا ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے وضاحت کی جاتی ہے کہ یہ صورت اکتیسویں باب میں اس موقع پر پیدا ہوئی جب اقبال نے قادیانی مسئلے پر پنڈت جواہر لال نہرو کے مسلسل مضامین (مطبوعہ ماڈرن ریویو کلکتہ) کا مدلل اور مسکت جواب دیا تھا اور پھر نہرو کے نام اپنے ایک خط میں یہ بھی فرمایا تھا کہ قادیانی ہندوستان اور اسلام دونوں کے غدار ہیں۔ یہ اندازہ لگانا کوئی زیادہ مشکل نہیں کہ مصنف نے اقبال کے اس اہم اقدام کو اختصار کی بھینٹ کیوں چڑھایا ہے۔ ذکر اقبال ۱۹۵۵ء میں لکھی گئی تھی۔ جب قادیانیوں کو کسی وکیل صفائی کی ضرورت تھی اور سرگزشتِ اقبال ۱۹۷۷ء میں لکھی گئی ہے۔ جب آئین میں قادیانی مسئلے کو حل کیا جا چکا ہے۔ مصلحت وقت کا تقاضا یہی تھا کہ یہاں اس مسئلے کو گول ہی کر دیا جائے۔ مصنف نے اسے احرار کا مسئلہ بنانے اور اقبال کو اس سے متاثر بتانے کی کوشش کی ہے۔

"دوسری طرف مجلسِ احرارِ اسلام نے احمدیوں کے خلاف ایک تحریک برپا کی جس کا مقصد یہ تھا کہ انہیں ایک الگ اقلیت قرار دیا جائے کیونکہ وہ دائرۂ اسلام میں شامل نہیں ہیں۔" (صفحہ ۴۶۶) حالانکہ صحیح صورت یہ ہے کہ قادیانی عملاً اپنے آپ کو جمہور مسلمانوں سے خود الگ سمجھتے تھے اور مصنف چند سطریں پہلے اس امر کا اعتراف بھی کر چکا ہے۔ اقبال پر قادیانیوں کے اصل رُخِ کردار کا انکشاف کشمیر کمیٹی کے معاملات میں ہوا اور انہوں نے جمہور مسلمانوں کے ساتھ یہ موقف اختیار کیا جسے بعد میں مجلسِ احرار نے ایک تحریک کی صورت دی۔ احرار کی سیاسی حکمتِ عملی سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس مسئلے میں ان کی خدمت اسلامی تاریخ کا ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے کہ انہوں نے ختمِ نبوت کے مسئلے پر مختلف مکاتبِ فکر کے مسلمانوں

کے جذبات کو ایک مطالبے کی صورت دی اور اس کے لئے تحریک چلائی۔

یونی نسٹ پارٹی اور روزنامہ "انقلاب" تو ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے جذباتی مسئلے معلوم ہوتے ہیں کہ سرگزشتِ اقبال میں بھی ان کے ذکر پر وہ خاصے جذباتی ہو گئے ہیں۔ کتاب کے آخری حصوں میں وہ اپنے آپ کو واقعات سے الگ نہیں رکھ سکے بلکہ خود نمائی کی حد تک جابجا نمودار ہوتے ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں ان کے نزدیک مسلم لیگ کا وجود چند افراد تک محدود تھا، احرار اور اتحادِ ملت بھی برائے نام رہ گئی تھیں۔ اگر جماعتیں تھیں تو صرف دو تھیں۔ ایک یونی نسٹ کہ اس کا پنجاب میں طوطی بولتا تھا۔ (صفحہ ۴۵۹) اور دوسرے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن، جس کے وہ خود سیکرٹری تھے اور جو جلسے کرنے پر قادر تھی۔ (صفحہ ۵۱۱، ۵۲۱) اور ان کے نزدیک اس دور کا ترجمان کوئی اخبار تھا تو "انقلاب" تھا (کیونکہ وہ خود اسی کے آئینے میں اس دور کی جھلک دیکھتے ہیں) یہ موقف اور یہ طریق ایک فریق کا تو ہو سکتا ہے۔ ایک مؤرخ اور مبصر کا نہیں کہا جا سکتا۔ یہ درست ہے کہ مجلسِ احرار کی سیاسی ساکھ کو مسجد شہید گنج کے مسئلے نے بڑا دھکا لگایا تھا لیکن احرار کی جماعتی تنظیم اپنا وجود رکھتی تھی اور اس کے کارکن جہاں بھی تھے اپنی وفاداریوں میں پکے تھے۔ مجلس اتحادِ ملت شہید گنج کے پس منظر میں ایک نئی جماعت کے طور پر (احرار میں سے ہی) ابھری تھی لیکن اس نے ابھی منظم صورت اختیار نہیں کی تھی۔ خاکسار تحریک ابھی مقبولیت کے مرحلے میں داخل نہیں ہوئی تھی تاہم اپنے وجود کا اظہار کرنے لگی تھی۔ مسلم لیگ نے ۱۹۳۶ء تک عوامی جماعت ہونے کا دعویٰ ہی نہیں کیا تھا۔ اس لئے اس کے کارکن بھی یقیناً گنتی ہی کے تھے (جن کا تذکرہ مصنف بڑے تضحیک آمیز پیرائے میں کرتا ہے۔ مثلاً صفحہ ۵۱۹) لیکن اس صورتِ حال سے یہ نتیجہ نکالنا کہ پنجاب میں یونی نسٹ پارٹی کا طوطی بولتا تھا اور دوسری بڑی تنظیم مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی تھی، درست نہیں ہے۔

یونی نسٹ نام کی حقیقت میں کوئی تنظیم یا جماعت تھی ہی نہیں۔ ہاں انگریز سرکار کی سرپرستی میں مفاد پرستوں کا ایک ٹولہ ضرور تھا جس کے کارکن، نمبردار، سفید پوش ذیلدار آنریری مجسٹریٹ وغیرہ قسم کے لوگ تھے جو ذرا ذرا سے مفادات اور "صاحب" کے اشارے پر اکٹھے ہو جاتے تھے (اور پنجاب کے مخصوص تاریخی حالات نے اس غلامانہ ذہنیت کو پروان چڑھایا۔ اس کی ایک زندہ مثال ہمارے زمانے میں راتوں رات ری پبلکن پارٹی کی شکل کا نمودار ہونا ہے)

"انقلاب" یونی نسٹ پارٹی کا نقیبِ خصوصی تھا لیکن یہ اخبار سرکاری گزٹ کے طور پر میونسپل لائبریریوں اور سرکاری دفتروں کے علاوہ کم ہی کہیں نظر آتا تھا۔ اس زمانے میں پنجاب میں جن مسلم اخبارات کو قبولِ عام کا درجہ حاصل تھا ان میں "زمیندار" اور "احسان" پیش پیش تھے۔ بعد میں شہباز بھی ان میں شامل ہو گیا تھا لیکن مصنف موصوف کا المیہ یہ ہے کہ وہ ساری دنیا کو روزنامہ "انقلاب" کی چلمن سے دیکھنا اور فیصلے صادر کرتا ہے۔ جہاں تک مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا تعلق ہے، طلبہ کی یہ تنظیم ۱۹۳۷ء میں وجود میں ضرور آچکی تھی لیکن اس کا دائرہ بھی مسلم لیگ کی طرح چند افراد تک محدود تھا۔ یہ تنظیم مسلم طلبہ کی تحریک کی صورت میں ۱۹۴۰ء کے بعد پروان چڑھی۔ (معلوم نہیں، اس وقت اس میں مصنف مذکور کا کردار کیا تھا!)

مصنف نے خود نمائی کے فراواں جذبے کے تحت اقبال کی سرگزشت کے نام سے اپنی تشہیر کرتے ہوئے تاریخی حالات کو خاصا مسخ کیا ہے اور ایک جگہ تو وہ حضرت علامہ کے بھی مشیر با تدبیر بن گئے ہیں۔ (صفحہ ۲۴۲) اور بلا حوالہ ایسی باتیں کہہ گئے ہیں جو "چھوٹا منہ بڑی بات" کی ذیل میں آتی ہیں۔ خود پسند مصنف نے کتاب کے آخری حصے میں بھی حضرت علامہ کی ذات کو طنز و تعریض کے حربوں سے مجروح کرنے کی کوشش کی ہے، ملاحظہ فرمائیے :

۱۔ "اس خطبے سے مجموعی تاثر یہ ملتا ہے کہ علامہ میں بعض سرکار پرست مسلمان رہنماؤں کی طویل صحبت سے جو مصلحت اندیشی پیدا ہو چکی تھی اور جس کی وجہ سے وہ مسائل پر اظہارِ خیال میں کچھ حجابات، کچھ احتیاط کوشی اور کسی قدر عافیت کوشی کی روش پر گامزن تھے"۔ (صفحہ ۳۸۴) گویا اقبال بڑے مصلحت کوش تھے (اور شاید مصنف یہاں یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ مدیرانِ "انقلاب" کی "انقلابی" کوششوں سے علامہ کی مصلحت کوشی کا طلسم ٹوٹا؟)

۲۔ "جہاں تک علمی کاموں کا تعلق ہے علامہ کا المیہ یہ تھا کہ وہ بہت سے مختلف النوع موضوعات پر تحقیق کرنا چاہتے تھے"۔ (صفحہ ۴۹۸) چہ خوب! گویا علم کسی ایک کوزے میں بند ہے اور اقبال کے لیے عوام کی حد تک سوچنا بھی ممنوع تھا۔

۳۔ "رہی باتیں۔ تو علامہ ایک عظیم متکلم" تھے اور جہاں احباب بیٹھے ہوں وہاں گفتگو کئے بغیر رہنا ان کے بس کا روگ نہیں تھا (صفحہ ۵۴۷) مطلب یہ ہوا کہ اقبال اپنے عہد کے بہت بڑے" باتونی" تھے۔ سالک نے تو متکلم کے ساتھ انگریزی لفظ (Conversationalist) لکھ کر کچھ پردہ داری سے کام لیا تھا۔ ابنِ سالک نے اس حجاب کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ع اگر پدر نتواند پسر تمام کند

اس تصنیف میں فکر اقبال کو پی پی پی کے نعروں سے بھی ہپنیٹ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لکھا ہے اس خواب کی تعبیر کا آغاز بھی اقبال کی وفات کے کم و بیش ایک تہائی صدی بعد اسلامی ملکوں کی تنظیم اور تیسری دنیا کے اتحاد کی صورت میں ہو رہا ہے۔ (صفحہ ۴۸۷) اقبال کے ہاں مشرق و مغرب کا تصور تو ملتا ہے اور اتحاد عالم اسلامی کی آرزو بھی لیکن تیسری دنیا کا کوئی تصور نہ اقبال کے سامنے تھا اور نہ ان کے زمانے میں اس قسم کی کوئی سیاسی اصطلاح وضع ہوئی تھی۔

پاکستان میں تیسری دنیا کا نعرہ پی پی پی کے دانشوروں نے اسلامی سربراہی کانفرنس کے فوراً بعد لگایا اور پریس ٹرسٹ کے کالم نویسوں نے اسے حرز جاں بنالیا۔ (مصنّف موصوف کا اپنا شمار بھی انہی کالم نویسوں میں ہوتا ہے)

صفحہ ۷۷،۴ پر ایک جملہ ہے "یہ بات محل نظر ہے" چھپنے کے بعد اس کے مٹانے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ کیونکہ یہ جملہ شاید ۵ جولائی ۱۹۷۷ء سے پہلے کے حالات کی روشنی میں لکھا گیا تھا اور نئے حالات میں اس مسلک کا بدلنا ضروری ہوگیا تھا۔ ناصح حالی شاید ایسے ہی موقعوں کے لئے نصیحت کر گئے ہیں:

"چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی"

جی تو چاہتا ہے کہ اس نادر الوجود تصنیف کے ایک ایک ورق کا تجزیہ پیش کیا جائے اور شاید بعض احباب اس کا تقاضا بھی کریں لیکن راقم بوجوہ اس کتاب کو اتنی اہمیت دینا نہیں چاہتا۔ حقیقت میں مصنف تحقیق کے بکھیڑے میں پڑا ہی نہیں۔ تین چوتھائی کتاب طویل اقتباسات سے معمور ہے۔ آدھی سے زیادہ کتاب خارجی حالات و واقعات کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس میں علاّمہ اقبال کی حیات کم سے کم اور صحافتی تبصرے زیادہ سے زیادہ ہیں۔ قدم قدم پر "بہرحال" کی تکرار اس کتاب کے غیر متوازن ہونے اور مصنّف کی ذہنی بے چارگی کا ثبوت مہیا کرتی ہے۔ کتاب کے بعض حصّوں میں "یافت" کا لفظ اتنے تواتر سے آیا ہے کہ اس میں حضرت علاّمہ کی ضرورت سے زیادہ مصنف کی اپنی احتیاج جھلکتی نظر آتی ہے۔ موصوف چونکہ اقبال اکیڈمی کے خزانہ دار بھی ہیں اس لئے یافت کا تصوّر ان کے ذہن پر سوار معلوم ہوتا ہے۔ اندریں حالات اگر اس تصنیف کا نام "سرگزشتِ اقبال" کی بجائے "زرگزشتِ مصنف" رکھ دیا جائے تو نامناسب نہیں ہوگا۔

(روزنامہ "صداقت" ۲۱ اپریل ۱۹۷۸ء)

م ش کی ڈائری سے ایک اقتباس

"ڈاکٹر عبدالسلام خورشید پاکستان کے ہی نہیں برِصغیر کے ایک منجھے ہوئے صحافی اور صحافت کے ایک باوقار، تجربہ کار اور محنتی استاد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ وہ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے بانیوں میں ہیں۔ اگرچہ انہوں نے بعد میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن سے بوجوہ علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے انہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت پر کبھی کام نہیں کیا۔ یہ درست ہے کہ ان کے والدِ بزرگوار جناب عبدالمجید سالک مرحوم روزنامہ "انقلاب" کے بانیوں میں سے تھے۔ لیکن اس سے یہ مطلب اخذ کرنا کہ جناب ڈاکٹر عبدالسلام خورشید "انقلاب" کی سیاسی پالیسیوں سے متفق تھے درست نہیں، جناب خورشید صاحب کے قلم سے میں نے آج تک کوئی ایسی چیز نہیں پڑھی جس کو پاکستان کی مخالفت سے تعبیر کیا جاسکتا ہو۔

قیامِ پاکستان کے بعد انہوں نے صحافی، استاد، مصنف باپ، خاوند بیٹے اور دوست کی حیثیت میں ہمیشہ بلند اقدار کو اپنایا اور بجا طور پر شہرت اور نیک نامی حاصل کی وہ ایک ڈیڑھ سال تک پنجاب یونیورسٹی سے جہاں وہ جرنلزم کے شعبہ کے سربراہ ہیں ریٹائر ہوجائیں گے اور اپنی باقی ماندہ زندگی تعمیری اور تخلیقی مقاصد کے لئے وقف کردیں گے۔ انشاءاللہ

اگلے روز "صداقت" کے کالموں میں ان کی کتاب "سرگزشتِ اقبال" پر جو ایک فاضل نقاد کی طرف سے تبصرہ شائع ہوا تھا۔ اس میں قدرے ذاتیات کی تلخی آگئی تھی "صداقت" ایک معیاری جریدہ بننے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ ایک معیاری جریدے میں کسی شخص کو کسی کے خلاف جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیئے۔ میں ذاتی طور پر جناب ڈاکٹر عبدالسلام خورشید سے اس فروگزاشت پر معافی کا خواستگار ہوں۔ (روزنامہ "صداقت" لاہور ۲۷ اپریل ۱۹۷۸ء)

سرگزشتِ اقبال نہیں زرگزشتِ مصنّف

"ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا روزنامہ "صداقت" میں ایک مضمون بعنوان "سرگزشتِ اقبال یا زرگزشتِ مصنف" شائع ہوا تھا۔ جس کا جواب کتاب کے مصنّف نے دینے کی بجائے ان کی وکالت م۔ش صاحب نے کی۔ اور وکالت کا حق ادا کر دیا۔ جب ڈاکٹر صاحب نے وضاحت بھیجی تو نامعلوم وجوہ کی بنا پر وہ شائع نہ کی گئی، جس کی بنا پر ہم صحافتی اصولوں کے عین مطابق ڈاکٹر صاحب کا جوابی خط شائع کر رہے ہیں"۔

(ادارہ، اسلامی جمہوریہ)

مکرمی، سلام مسنون!

جناب م۔ش صاحب نے اپنی ڈائری ۲۷ اپریل میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے جو محامد و محاسن بیان کئے ہیں ان کا ایک صحافی اور دوست کی حیثیت سے انہیں حق پہنچتا ہے۔ لیکن میرے تنقیدی مضمون پر انہوں نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے اس میں "قدرے ذاتیات" کی تلخی اور جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے۔ اسے حقیقت سے گریز ہی کہا جا سکتا ہے جو "صداقت" کے نام سے بعید ہے۔

جناب م۔ش صاحب کو پہلے تو میرا مضمون ذرا غور سے پڑھنا چاہیئے تھا۔ جس میں کوئی بات حوالے اور سند کے بغیر نہیں کہی گئی۔ حتیٰ کہ جو ذاتی مشاہدہ ہے اس کی تائید کے لئے بھی یونیورسٹی کا ریکارڈ موجود ہے۔ دوسرے مضمون نگار کے بارے میں بھی جناب م۔ش صاحب کو کچھ معلومات حاصل کر لینی چاہیئے تھیں کہ وہ کون ہے؟ اور خورشید صاحب سے اس کی کیا ذاتی عداوت ہے؟ میں م۔ش صاحب کو اپنے بارے میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ میرا خورشید صاحب

سے زر، زمین، زن یا کسی دوسرے مفاد کے سلسلے میں کوئی تنازعہ نہیں۔ نہ آج تک میری ان سے کبھی پرخاش رہی ہے۔ ان کے اور میرے درمیان ذہنی اور زمینی بڑے فاصلے ہیں اور یہ فاصلے آپس میں کہیں متصادم نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں بنیادی طور پر تاریخ ادب کا معلّم اور محقق ہوں اور تحقیق میں بابائے محترم پروفیسر محمود خان شیرانی کا پیرو ہوں۔ بابا شیرانی تحقیق میں بے رو رعایت صداقت کا مسلک رکھتے تھے۔ کوئی مصلحت، کوئی لالچ، کوئی خوف انہیں سچی بات کہنے سے نہیں روک سکتا تھا اور نہ ہی صداقت کے اظہار میں کوئی درمیانی راستہ یا دروغ مصلحت آمیز اختیار کرتے تھے۔ سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے لیکن جس معاشرے میں منافقت اور دروغ کی بیماری شدید صورت اختیار کر جائے اس میں کسی کو تو یہ مسلک اختیار کرنا ہی چاہیئے کہ سچی بات بغیر کسی لگی لپٹی کے کہے اور پھر سنے بھی۔ اگر "صداقت" اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تو معاف کیجئے، اس کا نام بدل کر "معذرت" رکھ لیجئے "نہند زنگی نام کافور" کی تہمت تو اپنے اوپر نہ لیجئے۔

میں م۔ش صاحب کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے قلم سے کسی کے خلاف کوئی ذاتی حملہ نہ آج تک ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو گا۔ انشاء اللہ، لیکن اصولوں کے بارے میں کسی سمجھوتے اور منافقت کا میں قائل نہیں ہوں۔ پاکستان، قائدِ اعظم اور علامہ اقبال کے بارے میں علم و ادب یا فلسفہ و حکمت کے نام پر کسی بھی دانشور کو کھلی چھٹی دے دینا کہ وہ بلا تحقیق جو کچھ جی میں آئے کہتا پھرے میں سمجھتا ہوں کہ اس ملک کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے!

م۔ش صاحب اپنے دوستوں کا دفاع شوق سے کریں، لیکن دلیل کے ساتھ، رحم کی اپیل نہ کریں۔ اقبال پر کچھ لکھنا ذاتی مسئلہ نہیں، قومی مسئلہ ہے۔ میں اگر سچ کہنے کی جرأت رکھتا ہوں تو سچ سننے کی ہمت اور تحقیق کی تربیت سے سچ قبول کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہوں۔ بحث کو علم کے دائرے ہی میں رکھئے۔ میری آپ سے یہی اوّل و آخر گزارش ہے۔ (غلام حسین ذوالفقار لاہور)

بلا عنوان

ہو صداقت کیلئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

(اقبالؒ)

مولانا عبدالماجد دریا بادی مرحوم میرے بڑے مہربان تھے۔ اُن سے میرا قلمی رابطہ تھا، نیاز مندی کا شرف حاصل نہ ہوا۔ مولانا کئی سال تک لکھنؤ سے "سچ" اور "صدق جدید" نکالتے رہے جس میں ایک مستقل عنوان ہوتا تھا "سچی باتیں" کچھ اس قلمی تعلق کی وجہ سے کچھ ویسے ہی سر میں سودا سمایا کہ اس روایت کو باقی رکھا جائے اور کچھ نہیں تو علم و ادب ہی میں سہی۔ بابا شیرانی مرحوم کی روح بھی خوش ہو جائے گی کہ میری علمی نسل ابھی قائم ہے۔ سو ہم نے ایک روز بیٹھے بیٹھے سچی باتیں کہنے کا ارادہ کر لیا اور پھر دبی زبان سے اپنے بعض قریبی احباب سے بھی کہہ دیا کہ اپنا تو یہ خطرناک ارادہ ہو گیا ہے۔ اس لئے جس نے علیک سلیک کہہ کر رخصت ہونا ہے ہو جائے۔ ایک دو دُور اندیش دوستوں نے سمجھایا کہ کیا کرتے ہو، سچی باتیں کہہ کر رہو گے کہاں جاؤ گے کہاں، کچھ وقت کے تقاضوں کا خیال کرو۔ ایک فلسفی دوست نے سمجھایا کہ تم سچ کہہ لو گے لیکن تمہارا سچ سنے گا کون؟ باز آؤ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بَیر نہ رکھو۔ لیکن دوستوں کی ان نصیحتوں نے اپنے جنونِ شوق

میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ پھر اپنے رفیقِ جذبات غالب سے ایک روز ملاقات ہو گئی۔ اس امر میں مشورہ طلب کیا تو میرے اس قدیم رفیق نے یہ کہہ کر مسئلہ ہی حل کر دیا۔

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

سو اس مشورے کے بعد اب یہ ارادہ پختہ ہو گیا!

پہلے ایک سچی بات تو مجھے آج کے منتظمین جلسہ سے کرنی ہے کہ انہوں نے کس غلط فہمی میں اس بندۂ عاجز کو اس محفل اقبال میں بلایا ہے۔ میں تو اقبالی ہوں نہیں۔ اس لئے کہ جس ادارے کا میں نمک خوار ہوں وہ مجھے اقبالی نہیں مانتا۔ ایک ایسا ہی حادثہ میرے ساتھ دس سال پہلے بھی ہوا تھا۔ اس وقت مرحوم خلیق قریشی نے مجھے لائل پور (فیصل آباد) کے جشنِ صد سالۂ غالب میں بلا لیا تھا جب کہ میرا ادارہ غالب سے میری شناسائی کا قائل ہی نہیں تھا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اس میں اداروں کا بھی کوئی دوش نہیں۔ ہر جگہ ادارے کے اندر کچھ اجارے ہیں اور طاقت کے سر چشمے اصل میں یہی اجارے ہوتے ہیں، ادارے تو بالکل نردوش ہیں۔ انٹرنیشنل اقبال کانگریس ہوئی تو یہی اجارے پیش پیش تھے اور بڑھ بڑھ کر دلیلیں کما رہے تھے۔ آج سے اٹھارہ روز پہلے (۲۱ اپریل کو) بندہ تربتِ اقبال پر حاضر ہوا۔ عقیدت کے دو پھول اور محبت کے دو آنسو اس درویش خدامست اور عاشقِ رسولؐ کی تربت پر چڑھانا میرا برسوں کا معمول رہا ہے۔ یونیورسٹیوں نے چادریں چڑھانی تو بعد میں شروع کیں۔ میرا خیال تھا کہ اس موقع پر وہ سارے اجارے بھی آئیں گے جو اقبال کانگریس میں بھونرے کی طرح رقص کناں تھے، لیکن دیکھا تو وہاں صرف وائس چانسلر اور چند استاد (جو تقریباً ہر سال بربنائے عقیدت آتے ہیں)

اور دفتری عملے کے کچھ لوگ موجود تھے۔ نگاہیں ان بھونروں کو تلاش کرتی رہیں جو شاید اب کسی دوسرے محبوب کی تلاش میں نکل گئے تھے!

ہمارے معظم و محترم استاد ڈاکٹر سید عبداللہ بھی بڑے ستم ظریف واقع ہوئے ہیں کہ خواص کی انٹر کانٹی نینٹل فیم کانگریس سے پہلے ہی عوام کی موچی دروازہ اقبال اُردو کانفرنس منعقد کر کے اقبال کے پیغام کو لوگوں کے گھروں تک لے گئے اور پھر لاہور تک ہی اکتفا نہ کیا، اسلام آباد، راولپنڈی، پشاور، آزاد کشمیر اور ملتان تک بڑھتے چلے گئے اور آج اس سلسلے میں سرگودھا کو سر کرنے کے ارادے سے یہاں چڑھ آئے ہیں۔ خیر ہم تو ادنیٰ سپاہی ہیں اگرچہ کسی زمانے میں باغی سپاہی ایک فلم دیکھی تھی، شاید اس کا اثر ہے کہ کبھی کبھی اپنا مورچہ الگ بھی قائم کر لیتے ہیں اس لئے جناب سچی باتیں کہنے میں کچھ حد اعتدال سے تجاوز ہو جائے تو اس کی ذمہ داری جرنیل پر نہیں باغی سپاہی پر ہو گی۔

اقبال عوامی اُردو کانفرنس میں بھی ایسا ہوا کہ ہم نے آزاد کشمیر میں جا کر (چونکہ یہ مجاہدوں کی سرزمین ہے) اپنا ایک الگ مورچہ بنا لیا اور وہاں سے کچھ سچی سچی باتیں کہہ ڈالیں، اقبال کے سوانح نگاروں کے بارے میں یہ سچ کچھ طبیعتوں پر بار گزرا کچھ دانشوروں نے تو دہائی دینی بھی شروع کر دی کہ فلاں شخص (یعنی یہ بندۂ عاجز) انہیں چھیڑے گا۔ حالانکہ ابھی تو اقبال کے جشن منائے جا رہے تھے۔ اقبال پر اقبال اکیڈمی کی مطبوعات کے لئے آنکھیں ترس رہی تھیں۔

جناب، آپ نے مجھے محفل اقبال میں بلا کر جو غلطی کی ہے، اب اس کا خمیازہ بھی بھگتیے۔ میں اقبالی نہیں ہوں، اس لئے اقبال پر کیا کہہ سکتا ہوں اور پھر کہنے کی اب گنجائش بھی کہاں رہ گئی ہے۔ گزشتہ سال اقبال پر لکھنے والوں نے سیلاب کی صورت میں اتنا کچھ لکھ دیا ہے کہ اگر یہ قوم اس سیلاب سے بچ گئی تو ہیضے، بدہضمی کا خطرہ

پھر بھی باقی رہے گا۔ کیا ہیضے کے ٹیکوں کا بندوبست قوم نے کر لیا ہے۔ آخر قوم کا ہاضمہ کیسے درست ہو گا؟

میرے ہمزاد نے مجھ سے کہا کچھ تم بھی چارا کرو۔ خدمتِ خلق کا عہد باندھ کر اب کہاں چھپ رہے ہو۔ مَیں نے سمجھایا کہ میرے پاس جو دوا ہے وہ خاصی کڑوی ہے اور یہ قوم میٹھی لوریوں کی عادی ہو چکی ہے۔ کہا" لیکن تم نے تو سچی باتیں کہنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ کیا اسے بدل دو گے" میں نے لاجواب ہو کر سوچا یہ میرا ہمزاد بھی مجھے رسوا کرے گا۔ لیکن اس کی بات نہ مانیں تو کہاں جائیں۔ چنانچہ سچی باتیں کہنے کے لئے اقبالیات کی طرف توجہ کی۔ چھوٹے موٹے ناشروں کی کاوشوں پر نظر ڈالی تو کچھ دل میں خیال آیا کہ مرے کو مارے شاہ مدار والی بات ہو گی۔ پہلے شاہی اداروں کا رُخ کیا جائے کہ جابر سلطان کے آگے کلمۂ حق کہنا ہی بڑا جہاد ہے۔ سچ بولنے کا بھی بس مزا آ جائے گا۔ جی کڑا کر کے ادھر کا رُخ کیا۔ نمائش میں کچھ کتابیں شوکیسیں میں پڑی دیکھیں۔ بازار میں جا کر قیمتوں کو دیکھا اور پھر جیب کو ٹٹولا تو وہاں پہلے ہی مہنگائی نے بڑا سا سوراخ کر دیا تھا۔ خیر، کچھ مانگے تانگے کی کتابیں حاصل کیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن پر رننگ کمنٹری کرنے والوں سے سکور معلوم کرنا چاہا تو وہ بھی یہ نہ بتا سکے کہ اقبال اکیڈمی کا اصل سکور کیا ہے؟ اقبال اکیڈمی کے کارپردازوں سے دریافت کیا تو ان کو بھی اس معاملے میں لاعلم پایا۔ انہوں نے بتایا کہ بعض کتابوں کے لئے مصنّفوں اور مرتبوں (قینچی چلانے والوں) کو ایڈوانس پے منٹ ہو چکی ہے لیکن ہنوز مسوّدے نہیں ملے۔ تو حضرات، یہ سکور والی بات ذرا مشکل ہے۔ یہ تو پنجسالہ منصوبے کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا۔ وہ بھی میرا گمان ہے ورنہ دوسرا پنج سالہ منصوبہ بھی تو شروع ہو سکتا ہے۔ آخر اس پہیلی پر جو نئی باڑ لگائی گئی ہے۔ کیا وہ پہیلی کو یونہی چھوڑے گی۔ وہ بھی تو اپنا حق الخدمت وصول کرے گی۔ پاکستان، اسلام، اقبال اور

قائدِ اعظم کے افکار و نظریات کی ترویج و ترقی کے لئے حکومت ولائتی بیج اور کھاد فراہم کرتی رہے گی۔ کھیت بوئے جاتے رہیں گے اور باڑیں کھیتوں کو کھاتی رہیں گی!
(آخر یہ تیس سال کی کہنہ روایت ہے کوئی ایک دو روز کی بات نہیں)

سچ بولنے کے سلسلے میں اب میری پہلی حکایت ذرا کان کھول کر سُنیئے۔ میں نے سچ بولنے کے لئے پہلی کتاب جو انتخاب کی وہ سرگزشتِ اقبال تھی۔ اس خیال سے کہ یہ اقبالیات پر بنیادی کتاب ہے اور ایک نامور دانشور نے لکھی ہے۔ کتاب کا لفظ لفظ پڑھا۔ ذات پات کی قید سے بلند ہو کر بے لاگ جائزہ لیا اور دیانتداری سے جو سچی باتیں ذہن میں آئیں، لکھ ڈالیں۔ یہ تحریر سالِ رواں کی ۲۳ جنوری کو لکھی گئی۔ اب سوچا کہ یہ سچ چھاپے گا کون؟ بعض قومی اخبار کلمۂ حق کہتے تو ہیں لیکن پہلے صاحب سے بھی پوچھ لیتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد کا تو اپنا "صدق جدید" تھا۔ میرا تو کوئی "صدق قدیم" بھی نہیں۔ اتنے میں پتہ چلا کہ لاہور سے ایک نیا صحیفہ "صداقت" طلوع ہو رہا ہے۔ چند روز بعد مدیر صاحب کی طرف سے ایک مراسلہ بھی ملا کہ سچ بولو اور صداقت کے لئے کچھ لکھو۔ جی خوش ہوا کہ اس خشک سالی میں بھی کوئی سچ کا نام لینے والا ملا۔ فوراً جواب دیا کہ ضرور سچ بولیں گے اور صداقت کے لئے لکھیں گے لیکن از رہِ احتیاط یہ بھی پوچھ لیا کہ حضور، یہ ذمہ داری کا بارِ گراں اپنے کندھوں پر اٹھا رہے ہیں، نباہ لیں گے؟ تحریری جواب تو کچھ نہ آیا۔ لیکن زبانی بتایا گیا کہ نباہ لیں گے۔ ہم نے "صداقت" میں سچ بولنے کی خاطر اپنا مضمون روک لیا۔ ۳ اپریل کو صداقت نمودار ہوا۔ چند مضامین پیش کئے جن میں سرگزشتِ اقبال والا تبصرہ بھی تھا۔ احتیاطاً مدیر سے یہ بھی کہہ دیا کہ اسے ذرا حفاظت سے رکھیں۔ کچھ لوگ اس کی ٹوہ میں ہوں گے۔ طے پایا کہ یہ مضمون ۱۲ اپریل کو خاص نمبر میں چھپے گا۔ ۱۹ اپریل کو علی الصباح مجھے اطلاع ملی کہ مضمون

کا مسودہ غائب ہے۔ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ احتیاطاً اصل مسودے کی ایک فوٹو سٹیٹ کاپی موجود تھی جو تلاشِ بسیار کے بعد مل گئی اور اس طرح "یہ سچ" بڑی مشکل سے منظرِ عام پر آ سکا۔

مضمون چھپا تو قدرتی طور پر ایک "دھماکہ" ہوا۔ کچھ وفد آنے شروع ہوئے بعض نے واہ واہ کی۔ بعض نے گلے شکوے کا انداز اختیار کیا۔ یہ مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ "صداقت" پر سچ چھاپنے کے کارن کیا بیتی۔ البتہ چھ روز بعد ۲۷ اپریل کے صداقت میں م۔ش کی ڈائری نظر سے گزری جس میں اس سچ کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کی گئی تھی اور اسے ذاتیات کا مسئلہ قرار دیتے ہوئے اپنی طرف سے معافی مانگی گئی تھی۔ میں ان بزرگ سے کوئی زیادہ واقفیت نہیں رکھتا (م۔ش مخفف اور غالباً معذرت شاہ نام ہے) ان کے معذرت نامے کے پس پردہ کون سی مصلحت کار فرما تھی اور کون سا قصۂ آں شبے حائل تھا۔ راقم اس سے بے خبر ہے۔ البتہ ڈائری چھپی تو دوسرے روز ہی میں نے ایک وضاحتی خط ایڈیٹر، صداقت کے نام بھیج دیا جو آج دس روز گزرنے کے بعد بھی صداقت میں نہیں چھپ سکا۔ شاید یہ سچ "صداقت" کو راس نہیں آیا۔ مجھے مدیرِ "صداقت" سے کوئی شکایت نہیں اور میں اسے کبھی سچ بولنے پر مجبور نہیں کروں گا۔

یہ ہے ایک سچ کی سچی سچی کہانی۔ اب مجھے میرے دوستوں کے خطوط آ رہے ہیں کہ دوسرا سچ کب بولو گے۔ میں سجاد حیدر یلدرم کی طرح یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ۔" میں صرف یہ کہتا ہوں کہ پہلے ایک سچ حلق سے نیچے اُتر لے پھر دوسرے کی باری آئے گی۔ کیونکہ مریض ناتواں ہے اور کڑوی دوا زبردستی اس کے حلق میں نہیں اُنڈیلی جا سکتی۔

(۸ مئی ۱۹۷۸ء کو ینگ لائیرز سرکل سرگودھا میں پڑھا گیا)

(اسلامی جمہوریہ ۱۵ مئی ۱۹۷۸ء)

مسئلہ اقبالؒ کی تاریخ ولادت کا

چند ہفتے قبل لاہور میں پاکستان و بھارت کی کرکٹ ٹیموں کے مابین دوسرا ٹیسٹ میچ ہوا۔ بھارت سے ہماری دوستی کی قدریں اب کچھ ایسی اُستوار ہو چکی ہیں کہ یہ میچ توپ و تفنگ کے ساتھ چھمب، جوڑیاں، چونڈہ، واہگہ، کھیم کرن، فاضلکا کے میدانِ حرب و ضرب میں ہو یا گیند بلاّ اور ہاکی کے ساتھ کھیل کے میدان میں یا غالب و اقبال کے حوالے سے شعر و اَدب کے مرغزار میں ہو طبیعتیں مچل ہی جاتی ہیں اور مقابلے و مسابقے کے ساتھ دلچسپ صورتیں، بر سبیلِ حکایت ہوں یا بر سبیلِ شکایت پیدا ہو جاتی ہیں۔ سو کرکٹ کے اس ٹیسٹ میچ میں بھی یہی کچھ ہوا۔ ایک نہ دو ہفتے میں اکٹھی تین چھٹیاں ہو گئیں اور پنجاب یونیورسٹی نے تو یہاں بھی چوکا ہی لگا یا۔ خواہ اس سے سمسٹر کا سارا نظام درہم برہم ہوا لیکن اپنا من موجی تو بہل گیا۔ اِس صورتِ حال پر اور کسی کو نہیں تو ہمارے ایک قومی اخبار کو ایک عدد تاؤ بھی آیا اور اُس نے ایک عدد اداریہ لکھ کر اپنی برہمی کا اظہار بھی کر دیا۔ ہم بے زبان مخلوق، جو اتنی ڈھیر ساری چھٹیوں پر جز بز ہو رہے تھے، اس پر مطمئن ہو گئے کہ چلو ایک قومی اخبار نے ہمارے، اضطراب کی بھی ترجمانی کی۔ لیکن ہمارے ہاں کی نوکر شاہی بھی بڑی منہ زور ہے۔ اُس نے فوراً اس کا انتقام یوں لیا کہ ۹ نومبر کو سرکاری طور پر طے شدہ یومِ ولادتِ اقبالؒ کی چھٹی کو گول کر دیا۔ اس پر ہمارے قومی اخبار کو پھر طیش آیا اور اس نے پھر اداریہ لکھ کر اس افسرانہ بے حسی اور قومی نقصان پر احتجاج کیا اور اپنی طرف سے ۹ نومبر کی صبح کو تعلیمی اداروں کے بند ہونے کی خبر بھی لگا دی۔ ہمیں سرکاری طور پر تعطیل

کی اطلاع نہیں ملی تھی اس لئے جب ہم یونیورسٹی پہنچے تو یہاں کی یہ فضا تھی کہ کوئی اخباری اطلاع کے مطابق چھٹی کے موڈ میں تھا اور کوئی کام کرنے کے لئے پر تول رہا تھا۔ کچھ کلاسیں ہوئیں، کچھ بکھر گئیں۔ ہمارے قومی اخبار نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ۹ نومبر کی چھٹی کو جزوِ ایمان بنا کر اس پر مسلسل مضامین اور خطوط کا سلسلہ شروع کر دیا جو گا ہے گا ہے اب تک جاری ہے۔ افسر لوگ بھی دل ہی دل میں شادماں ہوں گے کہ اُن کے کارن ہی چھٹی کا یہ دن طے ہوا تھا اور وہی اب اس تعطیل کو گول بھی کر رہے ہیں:

وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

بچارا قومی اخبار خواہ مخواہ پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ کم از کم ہمیں علامہ اقبال سے اپنی بھرپور عقیدت و احترام کے باوجود اس امر میں افسر شاہی سے کوئی شکایت نہیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک ۹ نومبر کی یہ ساری اُلجھن ہی سابق حکومت کی ایما پر نوکر شاہی اور چند طوائف صفت دانشوروں کی پیدا کردہ ہے اور ہمارا قومی اخبار سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنی پیشہ ورانہ بے خبری میں اس اُلجھن کا شکار ہو رہا ہے بلکہ پوری قوم کو ابھی تک بڑے خلوص اور ڈھٹائی سے اس غلط تاریخ ولادت کے ماننے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ سرکاری اہتمام سے چھپنے والی مطبوعات میں ہر جگہ اس متنازع فیہ تاریخ یعنی ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو اقبال کے یوم ولادت کے طور پر درج کیا جا رہا ہے۔ صد سالہ یادگارِ اقبال کی برکھا لگی تو اس میں بیشمار اقبال ناشناس مرتبین بھی جلوہ گر ہو گئے اور انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک عدد قینچی پکڑی اور بے تحاشا ادھر اُدھر چلانی شروع کر دی۔ اس طرح اقبال پر سیلاب کی صورت بہت سی کتابیں سامنے آ گئیں جن میں یہ سرکاری تاریخِ ولادت چل نکلی اور چل رہی ہے۔ اب ڈاکٹر وحید قریشی ہزار محققانہ مضامین لکھ کر اس مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کریں، صوفی نظیر لاکھ چیخ و پکار

کریں اور دلیلیں لائیں، اُن کی معقول بات کو کون سُنے گا۔ یہ دور تو فیشن اور تقلید کا ہے۔ معقولیت کا اس میں کیا دخل؟

میرا ارادہ اس مضمون میں علامہ اقبال کی تاریخ ولادت پر محققانہ بحث چھیڑنے کا نہیں۔ یہ کام ڈاکٹر وحید قریشی "نقوش" کے اقبال نمبر ۲ میں اتنی تفصیل سے کر چکے ہیں کہ اس سے زیادہ شاید قاضی عبدالودود بار ایٹ لا بھی نہ کر سکتے۔ انہوں نے بنیادی سواد کے ساتھ ثانوی معلومات اور میرے خیال میں بعض بے ضرورت باتیں بھی اس کثرت سے پیش کر دی ہیں کہ اس بھاری بھرکم مقالے میں بحث کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہ جاتا۔ لیکن بنیادی استدلال اور اضافی دلائل کے اس انبار میں حقیقت شاید کچھ دب سی گئی ہے۔ اسی لئے بار لوگوں نے اس پر کسی مثبت ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ متعلقہ لوگوں نے ابھی اسے پڑھنے کی زحمت ہی گوارا نہ کی ہو، جس طرح میرے سامنے گزشتہ سالِ اقبال پر چھپنے والی بے شمار مطبوعات (کتابوں، رسالوں وغیرہ) کا انبار لگا رہتا ہے اور میں انہیں پڑھنے کے لئے وقت کی تلاش میں رہتا ہوں۔

سو، جنابِ والا! میری کوشش یہ ہو گی کہ اس کیس کے قابلِ ذکر پہلوؤں کو اختصار کے ساتھ پیش کر دوں اور فیصلہ آپ کی عقلِ سلیم پر چھوڑ دوں یا مستقبل کے اُس مؤرخ پر، جو کبھی تو معقولیت کے ساتھ علمی مسائل کو وقتی سیاسی مصالح سے بلند ہو کر دیکھے گا، اور صحیح نتائج اخذ کرے گا۔

علامہ اقبال کی تاریخ ولادت کا مسئلہ شروع ہی سے کچھ ایسا اُلجھا ہوا ہے کہ تعلیمی اسناد، معاصرین کی تحریروں، میونسپل کمیٹی سیالکوٹ کے ریکارڈ اور تاریخ ولادت کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والی شہادتوں کے مطابق یہ سلسلہ ۱۸۷۰ء سے لے کر ۱۸۸۰ء تک پھیلا ہوا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ان سب تاریخوں

کی تفصیل دی ہے لیکن بحث تین تاریخوں پر آ کر مرتکز ہو جاتی ہے اور وہ تاریخیں یہ ہیں :

(الف) اقبال کی تاریخ ولادت میونسپل کمیٹی سیالکوٹ کے ریکارڈ کے مطابق ، ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء ہے ۔ یہ تاریخ حضرت علامہ کی وفات کے بعد ۷ مئی ۱۹۳۸ء کے روزنامہ انقلاب میں پہلی بار چھپی ، بعد میں پروفیسر محمد طاہر فاروقی کی سیرتِ اقبال اور عبدالمجید سالک کی ذکر اقبال میں درج ہوئی ۔

(ب) اقبال کی تاریخِ ولادت ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ مطابق ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے ۔ اقبال نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے شروع میں اپنے تعلیمی کوائف کے ضمن میں پہلی بار اپنی یہ ہجری تاریخِ ولادت لکھی ہے ۔ لیکن قوسین میں عیسوی سنہ ۱۸۷۶ء دیا ہے ۔ روزگار فقیر کے مصنف نے اس پر تفصیلی بحث کر کے سنہ عیسوی کے مطابق ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو اقبال کا یوم ولادت قرار دیا ۔

(ج) اقبال درونِ خانہ کے مصنف خالد نظیر صوفی نے سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے ۱۸۷۰ء تا ۱۸۷۷ء کے ریکارڈ کی از سرِ نو چھان بین کر کے شیخ نور محمد عرف نتھو کے چار بچوں (دو لڑکوں اور دو لڑکیوں) کے اندراج ڈھونڈ نکالے اور اس مسئلے پر مفصل بحث کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ

حضرت علامہ نہ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو اور نہ ہی ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو پیدا ہوئے ۔ بلکہ اُن کی صحیح تاریخِ پیدائش ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء ہے ۔

" اقبال درونِ خانہ " بزمِ اقبال لاہور کی طرف سے پہلی بار اپریل ۱۹۷۱ء میں چھپی ، اس طرح یہ تینوں تاریخیں ۱۹۷۱ء تک منظرِ عام پر آ چکی تھیں ۔ پہلی تاریخ یعنی ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو فقیر سید وحید الدین اور خالد نظیر صوفی نے اس بناء پر مسترد کر دیا کہ اس تاریخ کو پیدا ہونے والا شیخ نور محمد کا لڑکا شیر خوارگی میں فوت ہو گیا تھا ۔ خاندانی

شہادتوں کی موجودگی میں یہ استرداد قبول کر لیا گیا۔ اب بحث آخری دو تاریخوں کی رہ گئی۔ پی ایچ ڈی کے مقالے والی تاریخ کو اس بنا پر فوقیت حاصل رہی ہے کہ یہ خود اقبال کی تحریر کردہ ہے اس میں اس لحاظ سے ایک جذباتی اپیل بھی ہے جس کے اکثر لوگ شکار ہوئے۔ کسی اور کا کیا کہوں خود میں بھی کچھ دیر اس سے متاثر رہا، اور یہ سوچا کہ اگر اقبال کی بیان کردہ تاریخ کو جھٹلایا گیا تو اس کا ناخوشگوار اثر اُن کے باقی خیالات کی صحت پر پڑے گا۔ لیکن جب یہ جذباتی رَو گزر گئی اور مسئلے کو تحقیقی نظر سے دیکھنا شروع کیا تو اس حقیقت کے علاوہ کہ کوئی شخص اپنی ولادت کا عینی شاہد نہیں ہو سکتا، مندرجہ ذیل حقائق بھی اس تاریخ ولادت کی صداقت کے منافی نظر آئے:

۱۔ حضرت علامہ نے سنہ ہجری کے مطابق جو سنہ عیسوی دیا ہے۔ خود اس میں ایک سال کا سہو ہوا ہے۔ اگر اقبال کی بیان کردہ تاریخ کو جذباتی لحاظ سے فوقیت ہی کا درجہ دینا ہے تو پھر یہ سہو بھی فوقیت کے طور پر قبول کرنا ہوگا۔

۲۔ مختلف تعلیمی اسناد میں درج کردہ عمر کے اندراجات کے لحاظ سے سنہ ولادت میں جو تفاوت پیدا ہوتا ہے وہ بھی متذکرہ بالا سنہ ہجری و عیسوی سے متصادم ہے۔ اگر اقبال ہی کی تحریر کو حجت ٹھہرایا جائے، اور یہ اندراجات بھی اقبال ہی کے ہیں، تو پھر ان سب تناقضات کو بھی قبول کرنا پڑے گا۔ یہ صورتِ حال ظاہر ہے، ہمیں کسی نتیجے پر نہ پہنچائے گی۔

۳۔ جن لوگوں نے پی ایچ ڈی کے مقالے میں تحریر کردہ تاریخ ولادت کو قبول کیا، انہوں نے اقبال کی تحریر کے ایک حصّے پر تو صاد کر دیا لیکن دوسرے جزو کو نظر انداز کر گئے کہ وہ سکول میں باقاعدہ داخلے سے قبل چند برس مدرسے میں عربی، فارسی بھی پڑھتے رہے۔ "A FEW YEARS" والے معاملے کو

گول کر دینے سے جو تسامح پیدا ہوا اُس پر غور کرنا بھی ضروری ہے۔ چند سال سے مراد تین سے لے کر نو سال ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ثانوی شہادتوں کی مدد سے یہ مدت پانچ سال قرار دی ہے۔ اگر اس مدت کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر اقبال نے تاریخ ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کے مطابق ۱۸۹۱ء میں ساڑھے تیرہ سال کی عمر میں مڈل، ۱۸۹۳ء میں ساڑھے پندرہ سال کی عمر میں میٹرک، ۱۸۹۵ء میں ساڑھے سترہ سال کی عمر میں انٹرمیڈیٹ اور ۱۸۹۷ء میں ساڑھے انیس سال کی عمر میں بی اے کے امتحانات پاس کیے۔ اس لحاظ سے اُنہیں ساڑھے پانچ سال کی عمر میں سکول میں داخل ہونا چاہیئے۔ اب اس عمر میں سکول کے داخلے کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر مدرسے میں چند سال عربی، فارسی پڑھنے کی بات کو کہاں لے جائیے گا؟

لامحالہ بات یہیں آجاتی ہے کہ اقبال ۱۸۷۷ء سے چند سال پہلے پیدا ہوئے، اس صورت میں خالد نظیر صوفی کی دریافت کے مطابق ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کی تاریخ ولادت درست ہے اور جب تک کوئی دوسری مضبوط دستاویزی شہادت، جو اس تحقیق کا بطلان کر دے، سامنے نہ آجائے۔ ہمیں علامہ اقبال کی اس تاریخ ولادت کو قبول کرنا ہوگا۔

اِن حقائق کی روشنی میں جب مجلس ترقیِ ادب لاہور نے اقبال کی تاریخ ولادت ۲۹ دسمبر ۱۹۷۳ء کے مطابق صد سالہ یادگار اقبال ۱۹۷۳ء میں منانے کا فیصلہ کیا تو یہ بالکل صحیح فیصلہ تھا۔ اگرچہ مجلس ترقی ادب یہ تقریب جنوری ۱۹۷۴ء میں منعقد کر سکی۔ لیکن اس سلسلے میں مجلس نے جو چند مطبوعات چھاپیں اُن پر ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کی تاریخ ولادت درج ہے۔ پھر کون سے ایسے حالات پیش آئے کہ اقبال کی نئی تاریخ ولادت کے تعین کے لیے حکومت کو ایک نئی کمیٹی قائم کرنی پڑی اور دانشوروں کی اس کمیٹی نے کیوں اُس تاریخ کو ترجیح دی جسے مجلس ترقی ادب کے فضلا نظر انداز

کر چکے تھے۔ حضرات! بات ہر پھر کر وہیں آ پہنچتی ہے، پاک بھارت ٹیسٹ میچ پر! شاید آپ کو یاد ہو گا کہ بھارت نے بھی ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کے مطابق اقبال کا صد سالہ جشنِ ولادت منانے کا اعلان کر دیا تھا جس پر ہماری سابقہ عوامی حکومت کے جذبۂ مسابقت نے انگڑائی لی۔ جوابِ آں غزل کے لئے وقت تھوڑا تھا، کچھ اور مصلحتوں کے پیشِ نظر بھی مزید وقت درکار تھا (۱۹۷۴ء میں اسلامی سربراہی کانفرنس اور ۱۹۷۶ء میں قائدِ اعظمؒ انٹرنیشنل کانگرس کا انعقاد ہو رہا تھا) چنانچہ دانشوروں کی ایک کمیٹی قائم کر دی گئی جس نے یہ طے کرنا تھا کہ حضرتِ علامہؒ کب پیدا ہوئے تھے؟ اور اس کے مطابق عوامی حکومت کو ایک اور جشن منانا تھا، انٹرنیشنل علامہؒ اقبال کانگرس کے نام سے! تاکہ طرۂ اقتدار کی کلغی میں ایک اور پر لگ جائے!

علامہؒ اقبال تاریخِ ولادت کمیٹی میں چند واجب الاحترام بزرگ بھی شامل تھے۔ اور عوامی حکومت کے وہ چہیتے دانشور بھی جو ہر دَور کے بُت صاحبوں اور نجۂ سقہ صاحبوں کے درباری رہے ہیں اور ہر دَور کے حاکموں کی ہر طرح کی دانشورانہ ضرورتوں کو پورا کرتے رہے ہیں۔ یہ مجھے معلوم نہیں کہ موجودہ حکمرانوں نے ان کی پیشہ ورانہ خدمات سے استفادہ کیا ہے کہ نہیں۔ ہو سکتا ہے ان کو ابھی اس کی ضرورت نہ پڑی ہو یا وہ اپنی دانشورانہ ضروریات میں خود کفیل ہوں۔ بہرحال انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمارے اِن دانشوروں کے پاس ہر قسم کا روغنِ قاز موجود ہے۔ جب حکومت کا بارِ گراں تھکا دے تو یہ خدمت کے لئے حاضر ہیں!

تاریخ ولادت کمیٹی کی ہیئتِ ترکیبی اور اس کی کارروائی کا مجھے کچھ زیادہ علم نہیں، کیونکہ اس کمیٹی کے جس رُکن سے بھی اس معاملے میں کچھ دریافت کرنے کی کوشش کی، اُس نے پُراسرار خاموشی کا وہ رُوپ اختیار کیا جو داتا دربار کے باہر جادوگھر سے جادو کا کھیل دیکھ کر نکلنے والے اختیار کیا کرتے تھے۔ سُنا ہے اس کمیٹی کے کچھ ارکان سیالکوٹ اور دوسرے شہروں میں بھی گئے۔ بڑے بوڑھوں اور بڑی

بوڑھوں کے بیانات بھی لیے گئے۔ موقع کا مشاہدہ بھی کیا گیا۔ اس تفتیش کے بعد شاید کچھ نشستند و گفتند کے ایسے مرحلے بھی آئے، جہاں لوگوں کی پگڑیاں بھی اچھلیں۔ ایک معتبر ذریعے سے یہ معلوم ہوا کہ وفاقی سیکرٹری تعلیم نے کمیٹی کو پہلے ہی ہدایت فرمادی تھی کہ عوامی حکومت کی منشا ہے کہ ۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال کا صد سالہ جشنِ ولادت انٹرنیشنل سطح پر منایا جائے۔ عوامی حکومت کی منشا معلوم ہو جانے کے بعد ظاہر ہے کہ دانشور کیا کر سکتے تھے۔ سُنا ہے کچھ لوگوں نے لب بہ بند و گوش بند کا حکیمانہ مسلک اختیار کیا۔ جنہوں نے بولنے کی جرأت کی۔ انہیں عوامی حکومت کے منہ چڑھے دانشوروں کی منہ زوری نے چُپ کرا دیا۔ اللہ اللہ خیر صلا! اور اس طرح ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سرکاری طور پر یومِ ولادتِ اقبال قرار دے دیا گیا۔

انٹرنیشنل علامہ اقبال کانگرس جن حالات میں ہوئی جیسی بھی ہوئی۔ یہ قصہ میری آج کی گفتگو کا موضوع نہیں اس کے لئے کوئی اور موقع چاہیئے۔ البتہ یومِ ولادتِ اقبال کے سلسلے میں میری چند معروضات یہ ہیں:

۱۔ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کی تاریخ سابق حکومت کی عوامی ضروریات کے لئے چند پیشہ ور دانشوروں نے طے کی تھی اور اس غیر عقلی، غیر منطقی فیصلے کو قوم پر ٹھونسا گیا تھا۔

۲۔ صد سالہ جشنِ ولادت، جیسا بھی تھا، گزر گیا۔ یہ جشن ایک سو پانچویں سال بھی منایا جاتا تو جشنِ صد سالہ ہی کہلاتا۔ اصل کام اقبال کے افکار کی اشاعت اور اس پر عمل ہے۔

۳۔ حکومت تاریخ ولادت کے مسئلے کو محققین کی آزادانہ صوابدید پر چھوڑ دے یا اُن کی رائے معلوم کر کے اس بارے میں فیصلہ کرے۔ کیونکہ سرکاری مطبوعات اور نصابی کتابوں وغیرہ میں علامہ اقبال کی صحیح تاریخ ولادت کا اندراج ازبس ضروری ہے۔

۴۔ ۲۱ اپریل علامہ اقبال کا یوم وفات ہے۔ اس روز پورے پاکستان میں قومی تعطیل ہوا کرے اور حکیم الامت کی برسی شایانِ شان طریقے سے منائی جایا کرے۔ (اسلامی تاریخ میں بزرگانِ دین کی یاد عُرس کی صورت میں یوم وفات کے مطابق ہی منانے کا رواج رہا ہے)

۵۔ یوم ولادت پر عام تعطیل کی ضرورت نہیں۔ تعلیمی ادارے موسم سرما کی تعطیلات کی وجہ سے پہلے ہی دسمبر کے آخری ہفتے میں بند ہوتے ہیں۔ تقریبات ۲۹ دسمبر کو ہو سکتی ہیں اور قومی اخبارات چاہیں تو اس روز اپنے خاص نمبر شائع کر سکتے ہیں۔

پاکستان — تعبیر و تعمیر

تصنیف

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

پروفیسر ایمریطس و چیئرمین دائرۂ معارفِ اسلامیہ اُردو،
پنجاب یونیورسٹی

پاکستان کیوں کر بنا؟ اس کی تخلیقی غایت کیا تھی؟ اسے کن حالات کا سامنا ہے اور اس کی بقا و استحکام کن بنیادوں پر ہے؟ ملک کے نامور دانشمند نے تاریخی و عصری حقائق کا عالمانہ جائزہ لیتے ہوئے ان سوالوں کا جواب بڑے سلیس و دلنشیں انداز میں دیا ہے۔

یہ کتاب ہر پاکستانی مسلمان کے گھر میں ہونی چاہیئے تاکہ موجودہ اور آئندہ نسلیں اپنے بارے میں آگاہی حاصل کر کے ملک و قوم کے ضمن میں اپنا فرض ادا کر سکیں۔

- خوبصورت ٹائپ میں عمدہ سفید کاغذ پہ • مجلّد
- خوبصورت گرد پوش۔ • قیمت: چالیس روپے

اِقبالؒ کا ذہنی اِرتقاءَ

حضرت علامہؒ اقبال کے مستند سوانح حیات

مکتبہ خیابانِ اَدب کی نئی پیش کش ۱۹۷۸ء کا پہلا علمی و ادبی تحفہ، جسے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ایسوسی ایٹ پروفیسر پنجاب یونیورسٹی نے اپنے مخصوص تحقیقی انداز میں مستند حوالوں اور روایتوں کی مدد سے (زیادہ تر اقبال کی ذہنی سرگزشت کے طور پر) بیان کیا ہے۔ حکیم الاُمّت، شاعرِ مشرق کس طرح فکر و فن کی بلندیوں کی طرف بڑھتے چلے گئے؟ مہ و سال کے آئینے میں یہ داستان بڑے سلیس و دلنشیں انداز میں بیان ہوئی ہے جس سے اقبال کی حیات، شخصیت اور کارنامے جیتے جاگتے نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ ہر سطح کا قاری اسے پڑھ کر محظوظ اور مستفید ہو سکتا ہے۔

خوبصورت ٹائپ میں طباعت، عمدہ سفید دبیز کاغذ، مجلد، دیدہ زیب گرد پوش
صفحات، سوا دو سو، قیمت تیس روپے

نوٹ:
مکتبۂ خیابانِ اَدب، ۹ ۳ چیمبرلین روڈ
سے براہِ راست منگوانے پر خاص رعایت دی جائے گی۔

ظفر علی خان — ادیب و شاعر

تصنیف

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

مولانا ظفر علی خان کی حیات اور کارنامے تحریکِ آزادی اور ہماری ملّی تاریخ کا ناقابلِ فراموش باب اور ایمان افروز حصّہ ہیں۔ جدوجہدِ آزادی کے مختلف مراحل اور ظفر علی خان کی شخصیّت و کردار اور اُن کے شعری و ادبی کارناموں پر سلیس انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

خوبصورت ٹائپ میں،
سفید کاغذ پر،
مجلّد مع گرد پوش،
قیمت: ۱۲ روپے

مکتبہ خیابانِ ادب اور ایجنسی کی مطبوعات

ڈاکٹر سید عبداللہ پروفیسر (دوامی صاحب الامتیاز) کی تصنیفات

- اشاراتِ تنقید (تنقید اور نامور نقادوں کا مطالعہ) ۱۲ء۵۰
- ولی سے اقبال تک (چوتھا ایڈیشن) ۲۰ء۰۰
- اردو ادب ۱۸۵۷ء سے اب تک ۱۲ء۰۰
- تعلیمی خطبات ۲ء۵۰ • نقد میر (تیسرا ایڈیشن) ۱۵ء۰۰
- شعرائے اردو کے تذکرے ۳ء۰۰
- سہل اقبال (تصور خودی، عشق و عقل) ۲ء۰۰
- مسائل اقبال ۱۳ء۰۰
- سخن ور (نئے اور پرانے شاعر) ۱۳ء۰۰
- پاکستان میں اردو کا مسئلہ ۳۰ء۰۰
- پاکستان (تعبیر و تعمیر) ۳۰ء۰۰
- وجہی سے عبدالحق تک (دوسرا ایڈیشن مع مفید مضامین) ۵۰ء۰۰

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی تصانیف

- شاہ حاتم — حالات و کلام ۱۵ء۰۰
- مضامین سرسید — منتخبات تہذیب الاخلاق ۷ء۵۰
- ظفر علی خاں (ادیب و شاعر) ۱۲ء۰۰
- خیالات آزاد (نواب سید محمد آزاد) ۸ء۰۰
- محاسن خطوط غالب (مع انتخاب خطوط) ۷ء۵۰
- دیوان زادہ (شاہ حاتم کا مجموعہ کلام تاریخ وار) ۳۵ء۰۰

ڈاکٹر ممتاز منگلوری کی مرتب کردہ کلاسیکی کتب

- اندر سبھا (امانت لکھنوی) ۶ء۰۰
- باغ و بہار (میر امن کا مستند ایڈیشن) ۹ء۰۰
- نوابی دربار (نواب سید محمد آزاد) ... ۶ء۰۰
- فردوس بریں (عبدالحلیم شرر) مع تاریخی مقدمات.... ۹ء۰۰
- سوغات (علمی مضامین کا مجموعہ) ۱۲ء۰۰
- شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ ۸۰ء۰۰

- قاموس الاصطلاحات از شیخ منہاج الدین (مرحوم) ۳۰ء۰۰
- نذر رحمن ، جسٹس ایس اے رحمن کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت ۲۵ء۰۰
- مجموعہ قوانین اسلام جلد اول، دوم، سوم، چہارم فی جلد ۳۵ء۰۰
- قانونی لغت (تیسرا ایڈیشن اضافہ شدہ) ڈاکٹر تنزیل الرحمن ۳۰ء۰۰
- خطوط اقبال از پروفیسر رفیع الدین ہاشمی ۳۰ء۰۰

مطبوعہ جدید اردو ٹائپ پریس ، لاہور